انگارے

شوکت صدیقی

قیمت : چار روپئے پچاس پیسے

ناشر : فرینڈز بکڈپو دہلی

سول ایجنٹ

سہیل پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ دہلی

(انڈیا لیتھو پریس دہلی)

انتساب

"ان انگاروں کے نام
جو
خدا کی بستی کو جلا کر راکھ
کر دیتے ہیں"
شوکت صدیقی

ریاض الدین کا بڑا اچھا کاروبار چل رہا تھا۔ بڑے اچھے سے مراد یہ نہیں کہ وہ لکھ پتی تھا۔ بلکہ یہ کہ شہر میں نہ تو وہ کسی کا دستِ نگر تھا۔ نہ مقروض۔ اپنی روزی کماتا تھا اور فراغت کے ساتھ کھاتا تھا۔ ہزار پانچسو جمع بھی رہتے تھے۔ ریاض کا خاندان کل تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک بیوی فرزانہ بیگم۔ ایک لڑکا فیاض الدین اور ایک لڑکی زاہدہ۔ یہ تھا اس کا مختصر سا خاندان جو اللہ کی عنایتوں کے سہارے اچھے دن گذار رہا تھا۔ زاہدہ سب سے بڑی تھی جس کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ اور فیاض آٹھ سال کا تھا۔ زاہدہ چھٹی کلاس میں اور فیاض چوتھے درجے میں پڑھتا تھا۔ ریاض دن بھر اپنی دکان پر رہتا اور شام کو گھر واپس آیا کرتا۔

ایک دن فرزانہ بیگم باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھیں۔ اور بچے اسکول جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ یکایک دروازے پر ہیبت ناک قسم کی دستک ہوئی۔ فیاض نے بے ترتیب کتابوں کو پلنگ پر رکھکر دروازہ کھول دیا اور وہیں سے چلایا "ہائے امی جی بابا کو کیا ہو گیا"۔ فرزانہ گھبرائی ہوئی دوڑی تو دیکھا کہ لوگ ریاض الدین کو ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ سر اور بازو سے خون بہہ رہا تھا اور بے ہوشی طاری تھی۔ فرزانہ بیگم بدحواسی میں اندر کی

طرف بھاگی ۔ جلدی سے بستر ٹھیک کیا ۔ لوگوں نے ریاض کو پلنگ پر لٹا دیا فرزانہ بیگم نے محلے کے ایک صاحب سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر صدیق کو بلا دیں ۔ ایسے وقت کوئی کیا انکار کرتا ۔ وہ گئے اور فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے ۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کی ۔ ایک انجیکشن لگایا اور گھر والوں کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ، خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے کمزوری ہو گئی ہے ۔ انشاء اللہ دوپہر تک ہوش میں آجائیں گے ۔

دوکان کی چھت گر جانے سے بے چارے ریاض کو یہ چوٹ اٹھانی پڑی ۔ فرزانہ نے ادھر شوہر کی تیمارداری کی اور ادھر دونوں بہن بھائیوں کو دوکان پر بھیجا کہ تالا لگا کر آجائیں ۔ یہ دونوں دکان کا تالا لگا کر آ گئے اور دوپہر ہونے کا شدت سے انتظار کرنے لگے تاکہ ریاض ہوش میں آئے تو ان کو سکون اور اطمینان ہو ۔ جس گھر میں ہر وقت خوشی رہتی تھی اس وقت ہو کا عالم تھا ۔

دوپہر گذر گئی مگر ریاض ہوش میں نہ آیا فرزانہ کو فکر ہوئی اس نے پھر فوراً ہی ایک دوسرے ڈاکٹر کو بلوایا دوسرے ڈاکٹر نے ذرا اپنی ہوشیاری دکھانے کے لئے اور پہلے ڈاکٹر کو اناڑی ثابت کرنے کے لئے تمام پٹیاں کھول ڈالیں اور کہا کہ یہ پٹیاں غلط بندھی ہوئی ہیں ۔ میں پھر سے باندھتا ہوں ۔ اس دوبارہ جراحی سے ریاض کے زخم اور بھی چھل گئے ، بہرحال ڈاکٹر نے اپنا فرض پورا کیا اور اس نے بھی انجکشن لگا کر رات تک ہوش میں آجانے کا یقین دلایا ۔ فرزانہ بت بنی شوہر کے سرہانے بیٹھی رہی ، بچے بھی صبح سے پریشان تھے اور کچھ نہ کھایا تھا ! رات کے گیارہ بج گئے مگر ریاض کو ہوش اب بھی نہ آیا ۔ فرزانہ نے سوچا کہ وہ یہ رات کس طرح کاٹے گی

ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر کو دکھا دے تو اچھا ہو۔ مگر سوال یہ تھا کہ کون ڈاکٹر کو بلا کر لائے۔ بچوں کے بس کی یہ بات نہ تھی۔ پڑوسی سب سو چکے تھے۔ آخر اس نے خود ہمت کی۔ اور ڈاکٹر کے گھر پہنچی ڈاکٹر فرزانہ کو دیکھ کر پہچان گیا مگر کہنے لگا میں رات کے وقت مریض کو دیکھنے نہیں جایا کرتا۔ فرزانہ خوشامد کرنے لگی۔ تو ڈاکٹر منہ گھورتے ہوئے فرزانہ کے قریب آ کر کہا" شوہر کی جان کے بدلے تم کیا قربانی دے سکتی ہو" فرزانہ ایک لمحے کے لیے کچھ نہ سمجھ سکی مگر ڈاکٹر جواب کے انتظار میں بدستور گھور رہا تھا۔ فرزانہ کی عمر اس وقت اٹھائیس انتیس سال کی تھی بقول ایرانی شاعر کے یہ عورت کی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب اسے شراب کہنہ یا پورا کھلا ہوا گلاب کا پھول کہا جائے۔ فرزانہ کے حسن کی دھوم تھی جب اس کی شادی ہوئی تھی تو عورتیں کہتی تھیں" فرزانہ جس جگہ بیٹھ جاتی ہے وہ جگہ سجی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے۔" اور فرزانہ نے چوں کہ شادی کے بعد سے اب تک خوش حالی اور فارغ البالی میں عمر گذاری تھی اس لئے بھی اس کے حسن و جمال میں بڑھاپے کا اثر نہ تھا۔ حالاں کہ زاہدہ تیرہ سال کی تھی پھر بھی کم اولادی کی وجہ سے فرزانہ کی صحت اور حسن قائم رہا .... بہر حال ڈاکٹر کی نظروں کا مطالعہ کرتے ہوئے فرزانہ نے کہا" ڈاکٹر صاحب جس قابل ہوں اس سے انکار نہیں"

ڈاکٹر نے ذرا اور بے تکلف ہونے کی کوشش کی اور کہا" میرا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی یعنی میں جسم کی قربانی چاہتا ہوں۔" فرزانہ طیش میں آ گئی وہ بجلی کی طرح اٹھی اور ڈاکٹر کے کانوں پر ایک بھرپور چپت رسید کرتے ہوئے کہا" او بے شرم کیا تجھے اس لئے ڈاکٹری کی سند دی گئی ہے کہ تو جانوں کے عوض

عصمتوں کے سودے کرے۔ خدا کے عذاب سے ڈر۔" فرزانہ وہاں سے ڈاکٹر صدیق کے گھر گئی۔ ڈاکٹر صدیق نے آواز سنتے ہی کہا "ارے بہن جی میں تو شام ہی سے سوچ رہا تھا کہ میرے مریض کا کیا حال ہے۔ خیر تو ہے اس وقت کیسے آئی ہو" فرزانہ نے کہا "ڈاکٹر صاحب میری بیوقوفی اور فکر نے ایک اور ڈاکٹر کو بلالیا تھا مگر وہ ابتک بے ہوش ہیں" ڈاکٹر صدیق ہنسا اور کہنے لگا "کوئی بات نہیں بہن جی اس میں بیوقوفی کیسی۔ یہ تو آپ کی مرضی ہے جسے چاہیں دکھائیں اور جس سے چاہیں دوائیں چلئے میں چلتا ہوں" ڈاکٹر صدیق کی ویسے بھی پہلے سے آمد ورفت تھی اور وہ ہی اکثر ریاض، فرزانہ اور بچوں کو دیکھنے آیا کرتا تھا جب فرزانہ ڈاکٹر کو لیکر گھر پہنچی تو ریاض ہوش میں تھا مگر بچے سو رہے تھے فرزانہ کی مراد بر آئی اور وہ کھلا کھلا کر ہنس دی اور پوچھنے لگی "میرے سرتاج آپکو ہوش تو آگیا خدا کا شکر ہے میں تو ڈاکٹر صاحب کو لینے گئی تھی" مگر ریاض نے اس کا جواب بالکل الٹا ہی دیا "کاش میں مرجاتا" ڈاکٹر نے ریاض کو دیکھا ایک انجیکشن اور لگایا اور پٹیوں کو بدستور رہنے دیا۔ اور چلنے لگا تو فرزانہ نے فیس پیش کی۔ ڈاکٹر نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا جب تک میں اپنے مریض کو اچھا نہ دیکھ لوں گا فیس نہ لوں گا" فرزانہ نے اصرار مناسب نہ سمجھا اور مسکرا کر فیس واپس رکھ لی۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو فرزانہ نے ریاض سے بات کرنا چاہی۔ مگر ریاض نے بات نہ کی۔ اس وقت ریاض کے ذہن میں دوستوں کے وہ فقرے رقص کر رہے تھے "ابے یار ریاض ابھی ڈاکٹر صدیق کے یہاں سے آرہا ہوں تیری بیوی بھی بیٹھی تھی"

"میاں ریاض کیا قصہ ہے، جب دیکھو تمہاری بیوی ڈاکٹر صدیق کے پاس بیٹھی ملتی ہے۔ میاں کہیں کلیا میں گڑ نہ گھل جائے"......

"بھئی ریاض صاحب، کیا خراب ہے تمہاری بیوی کی طبیعت روز ڈاکٹر صدیق کے یہاں دیکھتا ہوں"۔ اور آج جب اسے ہوش آیا تو فرزانہ ڈاکٹر صدیق کے گھر تھی۔ ڈاکٹر صدیق نے چلتے وقت فیس بھی نہ لی۔ ریاض کو یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی ضرور بگڑ چکی ہے اور ڈاکٹر صدیق کے ساتھ ضرور اس کی کوئی گڑبڑ ہے۔ ایک تو تکلیف اور دوسرے یہ خیالات ریاض کے لئے خطرناک بن گئے وہ تندرست تو ہو چلا تھا مگر صرف اس لحاظ سے کہ اس کے زخم بھرنے لگے تھے مگر جسم کمزور ہوتا جا رہا تھا اس کی تمام پٹیاں کھل گئیں صرف ایک پٹی سر کی رہ گئی، ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ سر کی ہڈی اپنی جگہ پر قائم نہ ہو سکی جس کی وجہ سے زخم رس رہا ہے۔ بہرحال ریاض اس قابل ضرور ہو گیا کہ وہ دوکان پر جا سکے وہ پہلے دن دوکان گیا ادھر وہ دوکان پر گیا اور ادھر ڈاکٹر صدیق مریضوں کو دیکھتا ہوا فرزانہ کے پاس آ پہنچا اور فرزانہ سے کہنے لگا "خدا کا شکر ہے بہن جی ریاض صاحب اچھے ہو گئے اور اس وقت یہ جان کر تو اور بھی خوشی ہوئی کہ آج وہ دوکان پر بھی گئے ہیں بہرحال یہ تو میرا فرض تھا۔ ہاں اب آپ میری فیس ادا کر سکتی ہیں میرے کل ساڑھے چار سو روپے ہوتے ہیں، اس میں سے ۲۶۶ روپے میری فیس کے ہوتے ہیں میں ایک سو بائیس مرتبہ دیکھنے آیا اور باقی چوراسی روپے انجکشنوں کی قیمت ہے"۔ فرزانہ نے کہا "ڈاکٹر صاحب میں آپکی شکر گذار ہوں۔ آپ نے بڑی توجہ سے علاج کیا روپے آپ کے آج ہی آپ کے گھر پہنچ جائیں گے،

ذرا یہ دوکان سے لوٹ آئیں۔ ڈاکٹر "ہاں ہاں" کرکے مکان سے نکلا ہی تھا کہ ریاض دوکان سے واپس آرہا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے ریاض کو آتے نہیں دیکھا۔

ریاض گھر میں آکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ فرزانہ نے دیکھا تو پاس آکر بولی "کیا بات ہے۔ کیا درد ہو رہا ہے"؟

ریاض :۔ "تمہیں کیا۔ درد میرے ہو رہا ہے اور تم ہو کہ" ....

فرزانہ :۔ "آپ کا درد میرا درد ہے۔ آخر آپ بیماری سے اٹھ کر اس قسم کی اکھڑی اکھڑی سی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں"۔

ریاض :۔ "میری ہر خوشی اکھڑ چکی ہے اس بیماری نے تو ایک اور نیا دکھ دیدیا ہے۔ جو دکھ صرف موت ہی سے دور ہو سکتا ہے"۔

فرزانہ :۔ "اے ہے خدا نہ کرے۔ آپ کو ایسی باتیں کرتے ذرا خیال بھی تو نہیں آتا خدا نے کیا کہ پھر تندرست ہو گئے۔ اور اللہ نے چاہا تو یہ زخم بھی بھر جائے گا اور ہاں ابھی ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ ساڑھے چار سو روپے فیس کہتا تے تھے میں نے کہہ دیا کہ وہ آجائیں گے تو بھجوا دوں گی"۔

ریاض :۔ "میرے بعد ہی اس گھر کی دولت وہاں منتقل کراتی۔ میری زندگی میں میرا گھر کیوں خالی کئے دیتی ہو"

فرزانہ ان باتوں سے کچھ نہ سمجھی اور بولی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ سے علاج کیا ہے اگر ہزار بھی مانگتے تو دیتی جان بچ گئی تو سب کچھ ہے" ......

ریاض :۔ "ہاں صاحب اس کی توجہ نے تو یہ گل کھلایا ہے بہرحال فیاض

کے ہاتھ تم روپے ضرور بھیجدو۔ ورنہ بیچارے ڈاکٹر کا تمھاری طرف سے دل میلا ہو جائے گا"........

فرزانہ :۔ "ہاں یہی میں سوچتی ہوں"۔

روپے بھجوادئے گئے۔ ڈاکٹر اکثر دیکھنے آتا رہا۔ مگر ریاض کا ناسور اچھا نہ ہوا۔ اور اب تو اس کے سر سے کافی مواد بہنے لگا تھا اور حرارت بھی رہنے لگی تھی وہ ہر وقت چارپائی پر لیٹا ہوا ڈاکٹر اور فرزانہ کے متعلق سوچا رہتا کبھی اسے خیال آتا تھا کہ وہ خود تو مر ہی رہا ہے فرزانہ کو بھی جان سے مار دے تاکہ یہ بدنامی تو نہ ہو پھر اسے بچوں کا خیال آتا کہ اگر فرزانہ مر گئی تو بچوں کا کیا ہوگا۔ یہ بچے زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے کب لائق ہیں غرض وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچا ایک دن دوپہر کو جب فرزانہ کھانے سے فراغت پاکر شوہر کے پاس آکر بیٹھی تو ازراہِ فکر کہنے لگی "دوکان اتنے دنوں سے بند پڑی ہے جمع پونجی بھی ختم ہو گئی ہے زیور کی بھی نوبت آ پہنچی آج ایک گیا ہے کل دوسرا جائیگا میرا خیال ہے کہ دوکان پر فیاض کو بھیجدیا کردوں کچھ تو گھر میں آئے گا۔ ورنہ وہاں سامان الگ خراب ہوگا اور آمدنی علیحدہ بند ہو گی۔ آخر کیا ہوگا۔"

ریاض :۔ "تمھاری جو مرضی میں آئے کرو اور کیا ہوگا تو تمھیں کہنا بھی نہ چاہیئے۔ مجھے تو معلوم ہے کہ کیا ہوگا۔"

فرزانہ :۔ "کیا ہوگا آخر کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو"۔

ریاض :۔ "تم اس قدر نہ بنا کرو سب کچھ جانتی ہو اور مجھ سے پوچھتی ہو تو سن لو کہ میرے مرنے کا تمھیں انتظار ہے اور مرنے کے بعد ڈاکٹر صدیق سے

تمھارا نکاح ہوجائیگا"...... فرزانہ جیسے چونک گئی اس کے خلوص ومحبت کا مذاق اڑ رہا تھا۔ اس کی وفاداری پر حرف آرہا تھا اس کی عصمت مشکوک ہوچکی تھی اس نے شوہر کی جان کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس دن ڈاکٹر کے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا محض عصمت کی حفاظت اور شوہر کے یقین کو قائم رکھنے کیلئے مگر آج اس کی وہ تمام کوشش، پاکبازی اور نیکی ریت کے محل کی طرح ڈھے گئی تھی اس سے اور تو کچھ نہ ہوسکا وہ صرف اتنا کہہ سکی "آپ منہ سے بات نکالنے سے پہلے سوچ تو لیا کریں آج میری شادی کو سولہ سال گذر چکے ہیں اگر آپ کو یقین ہے کہ پچھلے دن میں نے باعصمت طور سے گذارے ہیں تو اب بھی یقین رکھنا چاہیئے۔ اور پھر میں کونسی جوان ہوں میری جوان اولاد ہے ذرا سوچ تو لیا کیجئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"

ریاض:۔ میں سب کچھ جانتا ہوں تم تو خیر ابھی جوان ہو تیس سال کی عمر کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی ۔ میں نے دانت ٹوٹی بوڑھیوں کو گمراہ ہوتے دیکھا ہے میں نے بھی زندگی گذاری ہے دوکان پر بیٹھکر ہزار رنگ دیکھتا ہوں کیا اپنے گھر میں رنگ نہیں پہچان سکتا مگر خاموش ہوں صرف فیاض اور زاہدہ کی وجہ سے اگر میں کوئی قدم اٹھاتا ہوں تو ان بیچاروں کی زندگی خراب ہوجائیگی"

فرزانہ:۔ خدا کے لئے آپ ذرا سوچئے خدا بات میں کیا سے کیا کہے جا رہے ہیں مجھے مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو جو میں جھوٹ بولوں مجھ سے تو آج تک ڈاکٹر صدیقی نے بہن کے علاوہ کوئی لفظ بھی نہیں کہا ہاں البتہ وہ ڈاکٹر جیلانی جو ایک دن پٹی باندھنے آیا تھا اس نے ضرور غیر معقول جملے بولے تھے اس رات

میں پہلے ڈاکٹر جیلانی کو بلانے گئی تھی مگر اس حرامزادے کی نیت میں نے بگڑی ہوئی دیکھی تو ایک طمانچہ رسید کیا اور پھر ڈاکٹر صدیق کو بلا کر لائی۔

ریاض:۔ اچھا تم خود فیصلہ کرو کہ جب تم نے اتنے بڑے واقعہ کی اطلاع آج دی ہے تو میں کیا اعتبار کروں کہ تم اور بھی باتیں سچ کہتی ہو۔ یہ بات تو ایسی تھی کہ جب میں بات کرنے لگا تھا اسی وقت بتاتیں۔ مگر بتاتی تو وجہ پاکباز ہوتی تم دل میں چور رکھتی ہو اسی لئے تو یہ بات اس وقت رو میں بتا دی۔

فرزانہ:۔ "فیاض کی جان کی قسم ہے میں نے صرف اس لئے یہ بات نہ بتائی تھی کہ خواہ مخواہ آپ کو سن کر افسوس ہوگا اور اگر غصہ آ گیا تو نہ جانے ڈاکٹر سے اڑ بیٹھیں اور بات پھیل جائے۔"

ریاض:۔ ایک بات دس طریقے سے ادا کی جاسکتی ہے تم دلیلیں دے سکتی ہو مگر پتھر کی لکیر تمہاری پھونکوں سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔ تم مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو جو ہر دھوکے کو خوب سمجھتا ہے۔ تم بے وقوف ہو اور مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرنا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ جب تک میں زندہ ہوں تم اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی میرے سامنے بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ سمجھیں؟

فرزانہ ایک عجیب الجھن میں تھی۔ اس کے شوہر کی بدگمانی اسے کھائے جا رہی تھی۔ وہ رات دن اسی غم میں گھلنے لگی۔ ایک تو شوہر کی بیماری کا غم اور دوسرے اس کی پاکبازی پر شکوک۔ ادھر زیورات کی فروخت۔ اس نے مجبور ہو کر زاہدہ کی تعلیم بند کر دی۔ اور فیاض کو زیر تعلیم رکھا۔ دوکان بھی مجبور ہو کر اونے پونے فروخت کر دی زاہدہ بھی ماشاء اللہ سیانی ہو گئی تھی۔ اور یہ بات محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کے والدین خاموش اور غمگین رہتے ہیں۔

ایک دن اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی امی سے اُن دونوں کی خاموشی کی وجہ پوچھ کر رہے گی۔ رات کو جب اس کے ابا سو گئے اور امی اپنے کمرے میں سونے کے لئے جانے لگی تو زاہدہ نے اپنی امی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور غمگین صورت بنا کر امی سے پوچھا۔ زاہدہ کہا:۔ امی کیا وجہ ہے کہ چند دنوں سے آپ ابا سے اور ابا آپ سے کھچے کھچے رہتے ہیں۔

فرزانہ:۔ کچھ نہیں میری بچی۔ یونہی تمہارے اباکی بیماری کی فکر مجھے کھائے جارہی ہے۔

زاھدہ:۔ لیکن اباجی آپ سے کیوں وہ مروت استعمال نہیں کرتے جو وہ اپنی بیماری سے پہلے کیا کرتے تھے۔

فرزانہ:۔ تمھارے ابا اپنی بیماری کی فکر میں ہر وقت اداس رہتے ہیں ان کو ہر وقت تم دونوں بہن بھائیوں کا اور میرا غم کھائے جارہا ہے کہ ان کے بعد ہم سب کا کیا ہوگا۔ ایسے وقت انسان کسی کو کیا مروت پیش کرسکتا ہے۔

زاھدہ:۔ ابا خواہ مخواہ فکر کررہے ہیں۔ اللہ میاں کارساز ہے۔ لیکن ان کو آرام کیوں نہیں آتا۔ حالاں کہ روزانہ ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔ اور بڑی توجہ سے علاج کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ابا ڈاکٹر صدیق کے علاج سے مطمئن نہیں ہیں۔ کیوں نہ ہم کسی دوسرے ڈاکٹر کا علاج تبدیل کردیں۔؟

فرزانہ:۔ لیکن علاج کس برتے پر تبدیل کریں اپنے پاس تو تمام اثاثہ ختم ہورہا ہے۔ اب تو شاید ہم زیادہ دن علاج بھی جاری نہ رکھ سکیں گے اب تو ہمارے پاس اتنا بھی نہیں رہا کہ ہم کوئی نوکر ہی رکھ لیں جو بازار سے دوا دارو اور سودا سلف لاکر دے جایا کرے۔

زاھدہ:۔ کیا امی جان میں یہ کام خود سرانجام نہیں دے سکتی۔

فرزانہ:۔ تم ماشاءاللہ سیانی ہوتی جارہی ہو۔ دل تو نہیں چاہتا کہ تم

بازار میں ایک قدم بھی رکھو لیکن شاید اللہ کو یہی منظور ہے۔ اچھا جو قسمت میں لکھا ہے وہ بھگتنا ہی پڑے گا۔

زاہدہ کا :۔ امی جان آپ فکر نہ کریں۔ میں انشاء اللہ بازار سے ہر قسم کا سودا سلف اتنی عقلمندی سے خرید اکروں گی کہ آپ کو میرے لڑکا ہونے کا گمان ہوگا۔

فرزانہ :۔ اچھا بیٹی تم اب جاکر اپنے کمرے میں سو رہو۔ کافی وقت گزر چکا ہے۔ میں بھی دن بھر کی تھکی ماندی ہوں۔ تمام دن تمہارے ابا کی خبرگیری کرتی ہوں۔ رات کو بھی دو چار دفعہ پانی پلانے کے لئے اٹھنا پڑتا ہے اگر اچھی طرح سوؤں گی نہیں تو خدا نہ کرے صحت خراب ہو جائیگی۔

فرزانہ بیگم نے اپنی بچی کا منہ چوما اور اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئی زاہدہ کو اب بازار میں اور ادھر ادھر پھرنے کی آزادی مل گئی تھی۔ اب گھر کا کوئی کام بھی ہو اس کی تکمیل زاہدہ کو کرنی پڑتی تھی۔ کیوں کہ فرزانہ بیگم تو صرف اپنے شوہر کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔

زاہدہ کی یہ عمر بقول شخصے ابھرتے سورج اور کھلتے پھول کی مانند تھی۔ اس عمر میں لڑکی بڑی ہی بیوقوف اور ناسمجھ ہوتی ہے۔ وہ محلے کے اوباش لڑکوں کے فقرے کو بڑی دلچسپی سے سنتی تھی۔ زاہدہ کے انتظار میں اکثر اس کا پڑوسی جاوید کھڑا رہتا تھا۔ اور جب زاہدہ اس کے پاس سے مچھلی کی طرح نکلتی تو وہ کہتا "میری ایک بات تو سن لو زاہدہ ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گا" زاہدہ دل میں سوچتی "جاوید بھی کیسی پاگلوں کی سی

باتیں کرتے ہیں۔ بھلا میں بات نہ کروں تو وہ زہر کیوں کھالیں گے۔
اس میں آخر کیا راز ہے اور پھر اس نے یہ بھی سن رکھا تھا جو شخص کسی وجہ سے زہر کھاکر مر جائے۔ تو اس کو پولیس پکڑ لیتی ہے۔ وہ اس فقرے سے بڑی خوفزدہ ہوجاتی۔ مگر ایک انجانی لطافت بھی اسے اس فقرے میں محسوس ہوتی۔ ایک دن جاوید نے ہمت کرکے زاہدہ کے برقعہ کا پلو پیچھے سے تھام کر چھوڑ دیا۔ زاہدہ نے گھوم کر اسے دیکھا اور کہا۔

"میں خالہ اماں سے شکایت کروں گی"۔

جاوید ڈر گیا کہ کہیں زاہدہ واقعی اس کی ماں سے شکایت نہ کردے اس نے تین چار روز کے لئے وہاں کھڑا ہونا بند کردیا۔ اب زاہدہ کو قدرتاً تشویش ہوئی کہ جاوید اسے کیوں نہیں ملتے۔ کہیں وہ میری بات کا برا تو نہیں مان گئے...... زاہدہ دوپہر کو جاوید کے گھر پہنچی۔ جاوید کی والدہ پلنگ پر بیٹھی چھالیاں کتر رہی تھی اور جاوید ایک کونے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اسے اس سال دسویں کا امتحان دینا تھا۔ زاہدہ نے جاوید کی طرف پشت کرلی اور اپنی خالہ اماں سے بات کرنے لگی۔ وہ جاوید کی اماں کو پڑوسن ہونے کی وجہ سے خالہ اماں کہتی تھی ورنہ کوئی رشتہ دار یا برادری نہ تھی۔

جاوید کی اماں بولیں۔

"آج تو بڑے دن میں آئیں"۔

زاہدہ:۔ جی ہاں خالہ جان گھر کے کام بہت بڑھ گئے ہیں۔ امی جان تو

بابا کی تیمار داری میں لگی رہتی ہیں اور میں تمام کام کرتی ہوں ....

جاوید کی امی :- ابھی تمہارے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔

زاھدہ :- جی نہیں۔ سر کا ناسور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ حرارت بھی ٹھہر گئی ہے۔

جاوید کی امی :- اللہ اپنا کرم کرے بھبو ڈاکٹر کا علاج بدل لینا چاہیئے کسی اور ڈاکٹر کا مشورہ لینا ضروری ہے۔

زاھدہ :- اجی اب پیسہ کا بھی تو سوال ہے ہزاروں روپیہ اٹھ چکا ہے دوکان بھی بک گئی۔

اور امی جی کی جھولنیاں تو آپ ہی کے پاس رکھی ہیں ایسی حالت میں زیادہ پیسے کے علاج کی ہمت نہیں ہوتی۔ جی تو چاہتا ہے کہ اگر لاکھ روپے بھی خرچ ہوں تو بابا سے قربان کر دوں مگر مجبوری بڑی بری چیز ہے۔

جاوید کی امی :- ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر جان ہے تو جہان ہے ابھی تو تمہاری امی کے پاس کافی زیور ہیں وہ کس دن کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ لگا دیں علاج میں۔

زاہدہ کے دل میں یہ بات آ گئی اور اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ ضرور امی جی سے کہے گی۔ مگر جاوید کو اپنی امی کی باتیں سنکر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں سارے محلے کے زیور گروی رکھ کر اپنا صندوق بھرتی رہی تھی۔ کیونکہ آج تک کوئی ایسا محلے والا نہ تھا۔ جس نے روپیہ دیکر زیور واپس لیا ہو بلکہ لینے کی کوشش بھی کی۔ تو سود ہی میں

برابر ہوگیا۔ جاوید کو سارے محلے کے لوگ چھیڑتے تھے کہ وہ سود خور والدین کا بیٹا ہے مگر وہ مجبور تھا۔ آخر والدین کو اس حرکت سے کیسے روکتا لیکن آج جب زاہدہ پر یہی داؤ چلتے دیکھا تو اس کو اپنی اماں پہ غصہ آنے لگا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور زاہدہ کی مدد کرے گا۔ زاہدہ کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا اور جب زاہدہ دروازے سے گذرنے لگی تو جاوید نے بے ساختہ اسے روک لیا۔ زاہدہ گھبرا گئی مگر جاوید اس سے یوں مخاطب ہوا۔

جاوید:۔ زاہدہ! ذرا ٹھہر جاؤ میری ایک بات سنتی جاؤ۔

زاہدہ:۔ اوئی اللہ اگر کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا۔

جاوید:۔ زاہدہ خدا کے لئے ٹھہر جاؤ۔ میں آپ کے بھلے کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

زاہدہ:۔ اچھا جلدی جلدی بیان کرو وہ بات ایسا نہ ہو کوئی آ جائے اور یہ بات میری امی تک پہنچ جائے۔

جاوید:۔ میری امی کے کہنے میں آ کر اپنی امی جی کو ہرگز یہ مشورہ نہ دینا کہ وہ اپنے زیورات فروخت کر دیں۔

زاہدہ:۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے آپ کو پتہ ہی ہے کہ میرے اباجی سخت بیمار ہیں اور ہمارا اثاثہ ان کی بیماری پر صرف ہو رہا ہے آخر ہم اپنا زیور گروی نہ رکھیں تو کیا کریں۔

جاوید:۔ آپ اگر اپنا زیور میری امی کے پاس گروی رکھیں گی تو

میری امی سے آپ وہ زیور نہ لے سکیں گی کیونکہ میری امی منافع کے بہانے اتنا سود روپیہ پر چڑھا دیتی ہیں کہ زیور سود میں ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری امی نے تمہاری جھولنیاں رکھ کر صرف ایک سو پچھتر روپے دیئے اور پچیس روپے منافع کے رکھ لیئے اور یہ شرط لگا دی کہ اگر تین مہینے میں اپنا زیور واپس نہ لیا تو پچیس روپے منافع کے اور دینے ہوں گے۔ آخر یہ منافع کیا ہے یہ سود ہے جو مسلمانوں میں حرام ہے اماں تمام محلے کا خون چوستی ہیں تو چوسا کریں مگر میں تمہارا خون انہیں چوسنے نہ دوں گا

زاهدہ :۔ تو پھر ہمیں ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔

جاوید :۔ اس دفعہ اگر تم زیور گھر سے لاؤ بھی تو میرے پاس لانا۔ میں وہ زیور رکھ کر تمہیں روپے دے دوں گا۔ اور یہ زیور بحفاظت میرے پاس رکھا رہے گا اور جب وقت چاہو گی لے جا سکو گی۔ زیور رکھنے کے لیئے میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ کہیں تمہاری امی کو کچھ شبہ نہ ہو جائے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس سے تم میری اماں کے پنجوں سے بچ جاؤ گی۔

زاہدہ کس قدر ممنون تھی جاوید کی۔ وہ چاہتی تھی کہ جاوید کے قدموں پر سر رکھ کر اس کا شکریہ ادا کرے مگر جلدی گھبراہٹ اور ایک نامعلوم شرم کی وجہ سے وہ صرف اچھا کہکر دروازے سے نکل گئی۔ دو تین روز بعد زاہدہ کو اس کی ماں نے کڑے دیئے اور کہا۔

" زاہدہ ان کو تم اپنی خالہ اماں کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ ہم لوگوں کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے اپنا منافع اگر معاف کر دو تو اچھا ہے۔

اور اگر وہ معاف نہ کریں۔ تو ان سے کہنا کہ اس کی جو کچھ قیمت بنتی ہو وہ دے دو۔ واپس نہیں چاہیئے یہ کڑے۔ اور دیکھو یہ بھی کہہ دینا کہ یہ بارہ تولے کے ہیں۔ اس وقت سونا بیاسی کے بھاؤ ہے تم اسی کے بھاؤ خرید لو۔ روپے حفاظت سے لیکر آنا۔ کسی کو نہ کڑے دکھانا اور نہ روپے۔ جاؤ!

زاہدہ پر امی جی کی اس التجا نے اور بھی اثر کیا اور وہ جاوید کی تمام باتوں پر مکمل ایمان لے آئی۔ وہ کڑے لیکر جاوید کے گھر پہنچی مگر جاوید اسکول تھا پھر بھی اس نے خالہ اماں سے ذکر چھیڑا۔

"خالہ اماں مجھے امی جی نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ میرے بارہ تولے کے کڑے ہیں کتنی قیمت میں لو گی۔"

جاوید کی اماں بولیں "! اے ہے بیچنے کی کیا ضرورت ہے گروی رکھدیں اللہ کرے گا پیسہ ہوگا تو چھڑوالیں۔

زاہدہ:۔ تو خالہ اماں پانچسو روپے چاہئیں پانچسو پر منافع کتنا ہوگا اور کس شرط پر ہوگا۔

جاوید کی اماں:۔ اس زمانے میں پانچسو دے دینا کوئی مذاق نہیں ہے۔ بارہ تولے پر کون پانچسو دے گا۔ میں تو تین سو روپے دے سکتی ہوں اور پچیس روپے ماہانہ منافع لوں گی۔ اگر تمہاری امی جی کی مرضی ہو تو پوچھ آؤ ورنہ کہیں اور دکھا دو۔

زاہدہ سوچنے لگی کہ نو سو روپے کی چیز پر خالہ اماں تین سو روپے کا وعدہ

کرتی ہیں۔ اور پچیس روپے ماہانہ منافع۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ سال بھر تک نہ ہم کپڑے چھڑا سکیں گے اور نہ رقم ادا ہوگی اس طرح بارہ تولے کے کپڑے خالہ اماں ہضم کرجائیں گی۔ اس نے بڑی قہر آلود نظروں سے خالہ اماں کو دیکھا اور کھڑی ہوگئی وہ پھر زاہدہ سے بولیں۔ دیکھ بیٹیا مجھے جواب جلدی دینا ورنہ روپے ختم ہوگئے تو یہ رہے سہے بھی چلے جائیں گے۔ وہ تو میری بہن کے برابر ہے۔ اس لئے ہمدردی سے کہہ رہی ہوں۔

زاہدہ نے غصّہ پیتے ...... ہوں ہوں کہا اور چلی آئی اور آکر امی جی سے کہہ دیا کہ خالہ اماں کہیں گئی ہوئی ہیں شام کو آئیں گی۔ یہ بہانہ اس نے جاوید کی وجہ سے کیا تھا تاکہ شام کو جاوید اسکول سے آجائے تو وہ بغیر کسی جھجک کے سارا معاملہ اسے سنادے وہ جاوید کو نہ جانے کیوں اپنا انتہائی ہمدرد اور مونس سمجھنے لگی تھی شام کو وہ کپڑے لے کر پھر جاوید کی اماں کے گھر پہنچی جاوید کھانا کھا رہا تھا اس نے جاوید کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی ماں سے کہا " خالہ اماں امی جی نے منع کر دیا ہے کہ دو ہزار کی چیز تین سو روپے میں کیسے دیدیں انھوں نے کہا ہے کہ میں بازار میں فروخت کردوں گی۔" یہ کہکر اس نے جاوید کی طرف پھر دیکھا۔

جاوید سمجھ گیا اور کھانا اسی طرح چھوڑ کر باہر چلا گیا ادھر اس کی امی کہنے لگیں،

"ہاں ہاں کیوں نہیں شوق سے بازار میں بکواؤ۔ مگر ان سے کہہ دینا کہ اپنی چھلیاں واپس لینی ہیں تو کل تک ڈھائی سو روپیہ منافع کے بھیجدیں

اور جھولنیاں لے لیں ورنہ پھر اپنی رقم لے لوں گی اور ان کا جھولنیوں پر کوئی حق نہ رہے گا بہت ہوگئی مروت، بھلائی کا یہ زمانہ ہی نہیں رہا گر ڈرے تو وہ بازار میں فروخت کرائیں گی اور آدھے رولڈ گولڈ کی جھولنیاں مجھے دے گئیں میں بھی کیسی رحم دل ہوں ذرا سی کسی کی تکلیف بھی نہیں دیکھی جاتی۔ جھٹ سے روپے نکال کر دے دیئے۔"

زاہدہ کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی مگر مصلحتاً خاموش ہوگئی۔ اور اٹھ کر باہر چلی آئی۔

باہر جاوید انتظار میں تھا، زاہدہ نے شرماتے شرماتے سب باتیں سنا دیں۔

جاوید کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا۔

اچھا تم جا کر اپنی امی سے کہہ دو کہ روپے کل مل جائیں گے میں سب انتظام کر لوں گا۔

زاہدہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کیسے انتظام کریں گے۔"

جاوید نے نظر بھر کر زاہدہ کو دیکھا اور کہا۔

"تمہاری خاطر میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

اور زاہدہ ہزاروں خیالات لئے گھر لوٹ آئی۔ اپنی امی جی سے کہہ دیا کہ روپے کل مل جائیں گے اور فرزانہ مطمئن ہوگئی۔ کہ روپے کل آ جائیں گے۔ فرزانہ کو افسوس تو ضرور تھا کہ اس کے کپڑے بھی جا رہے ہیں مگر شوہر کی بیماری

میں وہ اپنی آخری پونجی تک لگا دینے کو تیار تھی۔ ادھر جاوید کے سامنے ہزاروں خیالات تھے اسے اپنے گھر کی تمام کیفیت معلوم تھی وہ جانتا تھا کہ کہاں کہاں روپیہ اور زیور رکھا ہے بہرحال رات کے دو بجے کے قریب اس نے ایک صندوق کا تالا کھولا اور تالیاں جہاں سے اٹھائی تھیں واپس وہیں رکھ دیں اور پھر صندوق کھول کر اس میں سے پانچ ہزار روپے کے نوٹ نکال لئے اور جاکر اپنے چمڑے کے بستے میں بحفاظت رکھ دیئے اس کے بعد اس نے جاکر دروازہ کھول دیا اور صحن میں سے ایک اینٹ اٹھا کر اندر لایا اپنے پلنگ پر لیٹ کر اس نے وہی اینٹ زور سے صندوق پر ماری، ایک زور کی آواز گھر میں پھیل گئی اس کے ابا اور اماں جاگ اٹھے۔ جب وہ دونوں "کون ہے۔ کون ہے" کہکر اٹھے تو جاوید بھی اٹھ بیٹھا اور چلایا اباجی وہ کون بھاگا جا رہا ہے پکڑو اباجی پکڑو! اور اباجی چاروں طرف باؤلے کتے کی طرح بھاگ کر پھر صندوق کی طرف آگئے، بجلی جلائی تو صندوق کھلا پڑا ہے۔ تالا اور اینٹ بھی وہیں پڑے تھے جاوید کے ابا پھر ایک دم دروازے کی طرف بھاگے دروازہ کھلا ہوا تھا اسی غل کی وجہ سے اور پڑوسی بھی جاگ گئے اور ان کے دروازے پر جمع ہوگئے جاوید کے اباجی نے پڑوسیوں کو وہیں چھوڑ کر پہلے گئی ہوئی رقم کا اندازہ لگایا اور پھر باہر آکر لوگوں سے کہا کہ پانچہزار روپیہ نقد لے گیا آج ہی کسی کی امانت رکھی تھی اور آج ہی چور لے گئے وہ پولیس میں پہنچے پولیس آئی موقع محل دیکھا اور ادھر ادھر کے لوگوں سے سوالات کئے بات جہاں تھی وہیں رہی اور چوری کا پتہ اس

رات تو کیا لگتا آئندہ بھی نہ لگ سکا۔ جاوید خوش تھا کہ اس کا وار کامیاب رہا۔ وہ سوچنے لگا۔ صبح کو میں خود جا کر زاہدہ کی امی کو روپے دوں گا۔ اور کپڑے لے آؤں گا۔ اور ان کپڑوں کو میں زاہدہ کی نذر اس وقت کروں گا۔ جب وہ میری محبت کا جواب محبت سے دے گی جب وہ کہے گی جاوید تم میرے ہو۔ جب وہ میرے بغیر ایک پل زندہ نہ رہ سکے گی اور جب میں اپنے دھڑکتے دل کو اس کی مشک بیز زلفوں سے معطر کر سکوں گا۔ وہ انہیں خیالات میں غوطہ زن رہا اور آخر سو گیا۔

صبح کو فرزانہ بڑی بے چینی سے روپے کی منتظر تھی بار بار زاہدہ سے کہتی۔

فرزانہ:۔ زاہدہ! کیا بات ہے ابھی تک روپے نہیں آئے۔

زاہدہ:۔ امی جان مجھے خالہ جان نے کہا تھا کہ روپے صبح ہی بھجوا دیے جائیں گے۔

فرزانہ:۔ لیکن اب تو دوپہر ہونے کو آئی اور کوئی آدمی روپے لیکر نہیں آیا۔

زاہدہ:۔ امی جان آپ اتنی جلدی گھبرا رہی ہیں۔

فرزانہ:۔ گھبرانے کی بات ہی ہے تمہیں معلوم ہی ہے کہ روپوں کی اشد ضرورت ہے۔

زاہدہ:۔ کسی نے سچ کہا ہے غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔

فرزانہ:۔ اے ہے بیٹی کیسی باتیں کر رہی ہو جس تن لاگے سو تن جانے۔

زاھدہ:۔ آخر خالہ جان روپے کا بندوبست کر کے ہی بھجوائیں گی۔ ان کے پاس نہیں ہوگا جو انھوں نے مجھ سے کہا کہ کل صبح ہی بھجوا دونگی

فرزانہ:۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ روپے نہیں بھیجیں گی۔

زاھدہ:۔ اچھا امی جان اگر ایک گھنٹہ تک کوئی روپے لے کر نہ آیا تو میں خود ان کے ہاں جاؤں گی۔ بار بار ان کے گھر جانے سے اپنی عزت میں بھی تو فرق آتا ہے۔

زاھدہ:۔ اب اپنی ہے کہاں۔ انسان کی عزت دولت سے ہوتی ہے دولت گئی تو عزت بھی گئی۔

یہ باتیں ماں بیٹی میں درمیان ہو رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

زاہدہ دوڑی ہوئی گئی تو جاوید دروازہ میں کھڑا تھا۔ زاہدہ سے ایک دم میں خبر کا اظہار بھی نہ ہو سکا۔ بلکہ بڑی گھبراہٹ، بے چینی اور جھجک کے ساتھ امی جی کو جاوید کے آنے کی خبر دے سکی۔

فرزانہ:۔ آؤ بیٹا جاوید ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔

جاوید:۔ خالہ جان اسلام علیکم۔

فرزانہ:۔ وعلیکم اسلام۔ تمہاری امی کا کیا حال ہے۔

جاوید:۔ آپکی دعا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھی ہیں۔

فرزانہ:۔ بتاؤ بیٹا ہم غریبوں کے گھر کس طرح بھٹک پڑے۔

جاوید:۔ خالہ جان میں نے سنا ہے کہ آجکل آپکو روپیوں کی اشد

ضرورت ہے اور اس کے لئے آپنے میری امی کے پاس اپنی جھولنیاں بھی گروی رکھی ہیں۔

فرزانہ :۔ ہاں بیٹا تم نے ٹھیک سنا ہے ۔

جاوید :۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اب آپ اپنے کپڑے بھی میری امی کے پاس گروی رکھنا چاہتے ہیں۔

فرزانہ :۔ یہ بات بھی سچ ہے ۔

جاوید :۔ بات دراصل یہ ہے کہ خالہ جان جب سے میں نے آپ کے حالات سنے ہیں مجھے آپ سے بہت زیادہ ہمدردی پیدا ہو گئی ہے ۔

فرزانہ :۔ یہ تمھاری برخورداری ہے۔ اس زمانہ میں ایسے سعادت مند بیٹے کہاں ملتے ہیں ۔

جاوید :۔ خالہ جان آپ نے جھولنیاں میری امی کے پاس گروی رکھکر سخت غلطی کی ہے ۔ میں اپنی امی کو جانتا ہوں ۔ وہ آپکی جھولنیاں کبھی آپ کو واپس نہ کریں گی بلکہ سود میں ہی ختم کر دیں گی ۔

فرزانہ :۔ (ایک سرد آہ بھر کر) بیٹا جب برے دن آتے ہیں عقل بھی جاتی رہتی ہے اب تم ہی بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے

جاوید :۔ خالہ جان میں نے آپ کے حالات سے متاثر ہو کر آپ کے روپوں کا بندوبست کر دیا ہے ۔ میں نے ایک شریف آدمی سے بات کی تھی وہ آپ کے کپڑوں پر ایک ہزار روپیہ دینے کو تیار ہو گیا ہے ۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ آپ سے سود بھی نہ لے گا۔ بلکہ جب کبھی بھی آپ چاہیں تو اپنے کرڈے بغیر کسی منافع کے واپس لے سکتی ہیں ؛

فرزانہ نے انتہائی خوشی اور شکر کے جذبات کے ساتھ جاوید سے پوچھا،

" مگر جواب ایسا کون سا بھلا مانس ہے جس نے اتنی بڑی رقم دے دی اور پھر سود بھی نہ لے گا اور اصل بات تو یہ ہے کہ ڑے گرے ہوئے ہی سمجھو نہ تو ابھی حالات درست ہونے کی کوئی صورت ہے اور نہ اس رقم کی واپسی کی کوئی تدبیر نظر آتی ہے بہتر تو یہ ہو تاکہ جن صاحب سے رقم لائے ہو ان سے کہہ دیتے کہ وہ کپڑے فروخت کر دیں اور اپنی رقم لے لیں "

جاوید : - خالہ جی آپ فکر مند کیوں ہوتی ہیں انشاءاللہ تمام حالات درست ہو جائیں گے آپ ایک سال میں دو سال میں جب جی چاہے روپے دے دیں اور کپڑے واپس لے لیں اور یہی نہیں بلکہ اگر آئندہ بھی روپوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دیں میں انتظام کر دوں گا۔ البتہ میری اماں جی سے یہ ذکر بالکل نہ کیجئے کہ روپوں کا میں نے انتظام کیا ہے۔

فرزانہ :۔ "نہیں نہیں میں ذکر نہیں کروں گی۔ مگر میں تمھاری بہت ہی احسان مند ہوں تم نے اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں ساری عمر بھی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی"۔

جاوید :۔ "اچھا اب اجازت دیجئے"۔

فرزانہ :۔ نہیں آؤ اس بیٹھک میں آجاؤ کم از کم چائے پی کر تو جانا تم سے پردہ کس کا ہے پردہ تو غیر سے ہوتا ہے اور تم نے تو وہ کام کیا ہے جو اپنے بھی نہیں کر سکتے۔

جاوید جھجکتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا اور زاہدہ شرماتی ہوئی اس کے سامنے آ گئی۔

جاوید اندر داخل ہو کر ریاض کی مزاج پرسی کرنے لگا اور ریاض کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

یوں تو جاوید کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی مگر ریاض الدین کو جاوید کا اس طرح گھر میں بلا لینا اچھا نہ لگا ایک تو وہ بیوی کی طرف سے بدظن تھا ہی اس بات سے اور بھی یقین ہو گیا کہ اب اسے کسی بات کا احساس ہی نہیں رہا جسے چاہتی ہے گھر میں بلا لیتی ہے۔ بہر حال وہ خاموش تھا اتنے میں زاہدہ چائے بنا کر لائی اور جاوید کے سامنے چائے بڑھا دی۔

زاہدہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے مگر اپنے والد کی موجودگی کی وجہ سے اپنے آپ کو نابو میں کئے ہوئے تھی۔ جاوید نے چائے پی اور خصوصی طور سے زاہدہ کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

دوپہر کو فرزانہ نے ریاض الدین سے کہا۔

"دیکھئے تو بے چارا جاوید کس قدر ہمدرد ہے میں نے کپڑے اس کی امی کے پاس بھیجے تھے مگر وہ کہنے لگی کہ صرف تین سو روپے دوں گی۔ اور پچیس روپے ماہانہ سود لوں گی۔ جاوید کو امی کی یہ بات نہ بھائی۔ اور اس نے کسی اور شخص سے کپڑے رکھوا کر ایک ہزار روپے لادئیے ہیں وہ آدمی سود بھی نہ لے گا اور دو سال تک ہم کپڑے بھی واپس لے سکتے ہیں۔"

ریاض:۔ تم تو اس ذرا سے پیسے کی بدولت کوٹھے پر بھی بیٹھ سکتی ہو۔ ابھی میں مرا نہیں ہوں پھر بھی میرے پوچھے بغیر تم نے ایک نوجوان سے پردہ چھوڑ دیا اور گھر میں بلا لیا اور نہ صرف تم نے بلکہ زاہدہ کو بھی اس کے سامنے کر دیا۔ کیا تم اپنی عصمتوں کا بیوپار کر رہی ہو۔ آخر تمہارا جاوید کو گھر میں بلانے کا مقصد کیا تھا۔ کیا تم اندھی ہو کہ زاہدہ جوان ہے اور پھر بھی اسے گھر میں بلا لیا۔ تم نے خود اپنا پردہ چھوڑ دیا ہوتا مگر زاہدہ کا پردہ تو کرایا ہوتا۔ ......

فرزانہ:۔ (ذرا تیوری چڑھا کر) آپ تو بیماری سے چڑچڑے مزاج کے ہو گئے ہیں ہر بات آپ کو الٹی معلوم ہوتی ہے اور بلا سوچے سمجھے منہ سے کچھ نہ کچھ بول ہی دیتے ہیں مگر میں بھی اب کہے بغیر نہ رہوں گی کہ اگر ہمارے زیورات کی مناسب قیمت نہ ملی اور یہ بیماری اور بیروزگاری اسی طرح جاری رہی تو مجھے یقینی ایک دن کوٹھے پر ہی بیٹھنا پڑے گا۔ میں جس قدر چلن داری اور آپ کی ہمدردی کا دم بھرتی ہوں آپ اسی

قدر بدظن ہوتے جاتے ہیں ۔ ابھی سال بھر پہلے کیا جاوید گھر میں نہ آتا تھا کیا وہ اس وقت زاہدہ کے ساتھ نہ کھیلتا تھا ۔ حالاں کہ اس وقت بھی دونوں سیانے تھے ۔ ایک سال گذرنے میں کیا طوفان اٹھ گیا ہے اور میں تو کہتی ہوں جو اپنا اس قدر ہمدرد ہو اس میں اور اپنے میں فرق کیا ہے ۔ اپنوں کو تو آزما کر بھی دیکھ لیا ۔ اب کون ہے اپنوں میں سے ؟ کوئی خیریت تک تو پوچھنے آتا نہیں ۔

ریاض :۔ خیر تمہاری مرضی جو جی میں آئے کرو ۔ میں تو جب تک زندہ ہوں ان مناظر کو دیکھنے کیلئے مجبور ہوں ۔

فرزانہ :۔ آپ کی زندگی کے لئے ہی تو یہ سارے جتن کئے جا رہے ہیں ۔ ورنہ کوئی اور ہوتی تو اپنا ایک زیور بھی نہ جانے دیتی اور شوہر کو گھلا گھلا کر مار دیتی ۔ بہر حال کل آپ کو بڑے ہسپتال میں داخل کرا دوں گی اب جو کچھ پیسہ خرچ ہوگا دیکھا جائے گا ۔

ریاض :۔ ہاں اب اس گھر سے بھی بے دخل کر دو ۔ میرے پیچھے خوب گل چھرے اڑانا ۔

فرزانہ :۔ خیر اب آپ جو کچھ سمجھیں میں تو اپنا فرض پوری طرح ادا کر دوں گی ۔ میرا فیصلہ خدا کرے گا ۔ ....

دوسرے دن ریاض کو بڑے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا دونوں وقت فرزانہ ، زاہدہ اور ریاض ہسپتال جایا کرتے کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ فرزانہ اکیلی جاتی اور گھر پر ان دونوں کو چھوڑ جاتی ایسے وقت کی تلاش

میں جاوید اکثر رہا کرتا۔ اب اس کے آنے جانے میں پابندی تو تھی نہیں
جب فرزانہ کو اکیلے جاتے دیکھتا گھر میں آجاتا۔ زاہدہ کسی بہانے سے
فیاض کو ادھر ادھر کھیل کود یا کام میں لگا دیتی اور یہ دونوں باتیں کرتے رہتے
ایک دن جب فرزانہ ہسپتال گئی تو جاوید گھر میں آگیا فیاض اس وقت اسکول
گیا ہوا تھا زاہدہ اکیلی تھی۔ آج جاوید کو کہنے سننے کا اچھا موقع تھا۔

جاوید نے زاہدہ سے پوچھا،

"آج فیاض کہاں گیا ہے"

زاہدہ:۔ باہر کہیں کھیل رہا ہوگا۔

جاوید:۔ تم بھی بڑی وہ ہو ہر وقت اسے کھیل کود میں لگائے رکھتی ہو

زاہدہ:۔ میں اسے کیوں کھیل کود میں لگاؤں۔ وہ تو خود ہی کھیل کا پیارا ہے۔

جاوید:۔ اچھا آج تمہاری امی ابھی تک ہسپتال سے واپس کیوں نہیں آئی۔

زاہدہ:۔ آج دیر زیادہ ہی ہو گئی ہے آتی ہی ہوگی کیوں کیا بات ہے جو آپ پوچھ رہے ہیں۔

جاوید:۔ کوئی بات نہیں ہے میں نے یونہی پوچھا تھا

زاہدہ:۔ آج آپ کچھ کھوئے کھوئے سے کیوں ہیں۔

جاوید:۔ (اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے) نہیں تو۔

زاہدہ:۔ آخر آپ مجھ سے کیوں چھپاتے ہیں۔

جاوید :- تم کو معلوم ہے کہ میں نے آپ لوگوں کی وجہ سے کس قدر ذمہ داریاں اپنے سر پر لے لی ہیں ،

زاہدہ :- لیکن اس سے انکار کسے ہے ،

جاوید :- مگر آپ لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں ہے ،

زاہدہ :- ہم آپ کے ازحد شکر گذار ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہم اس بوجھ کے تلے دبے جا رہے ہیں ،

جاوید :- مگر باوجود اس کے جسے میں حاصل کرنا چاہتا ہوں اسے حاصل نہیں کر سکتا ،

زاہدہ :- آپ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں ،

جاوید :- کہہ دوں - برا تو نہ مانو گی ،

زاہدہ :- میں کیوں برا ماننے لگی ،

جاوید :- تو مجھے ، مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے ، ، ، ، ،

زاہدہ چونک سی گئی اس کے رخساروں پر رنگ برنگی سرخیاں رقص کرنے لگیں ۔ وہ ایک تو پہلے ہی چولہے کی گرمی سے گلنار ہو رہی تھی ۔ جاوید کا یہ فقرہ سنکر اور بھی لالہ زار بن گئی ،

اس کا دل ضرورت سے زیادہ دھڑکنے لگا ۔ ہونٹ خشک ہو گئے ۔ اور پسینے کے قطرے جھل مل جھل مل کرنے لگے ،

جاوید نے ذرا توقف کے بعد پھر کہا ،

"کیا میرا سوال برا لگا ہے کیا میری خواہش پوری نہ ہوگی۔ کیا میں تمھیں نہ پاسکوں گا۔"

زاہدہ نے اپنے اوسان قابو میں کرتے ہوئے بہت ہی دبی زبان میں کہا۔ "میں آپ کی ہوں۔"

اور جیسے جاوید کے کانوں میں یکا یک سینکڑوں سیٹیاں بجنے لگی ہوں اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ کسی میلے میں کھڑا ہے۔ اور دور سے کوئی نقرئی آواز اس کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جاوید نے مسرت سے زاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "اب یہ ہاتھ کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوں گے۔"

دونوں کے دل انتہائی رفتار سے دھڑک رہے تھے۔ اتنے ہی فیاض آگیا۔ اور یہ دھڑکنیں ہموار سی ہوگئیں۔ جاوید واپس چلا آیا۔

لیکن اب جاوید کے دل میں کئی کئی چکر لگنے ضروری تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دل کے اشارے ہوتے آنے کے وعدے ہوتے۔ بیقراریوں کا اظہار ہوتا۔ غرض دونوں ناسمجھی کی عمر میں عشق و محبت کی ان منزلوں سے گذر رہے تھے۔ جہاں سے واپس لوٹنا کم از کم طاقت انسانی میں تو نہیں۔

ریاض الدین کے سر کا آپریشن ہوا۔ گو آپریشن بقول سول سرجن کے کامیاب رہا۔ مگر بات بدستور رہی بلکہ زخم اور بڑھ گیا حرارت کی جگہ بخار نے اور بخار کی جگہ شدید بخار نے لے لی۔ جب حالت زیادہ

نازک ہوئی تو فرزانہ اپنے شوہر کو گھر لے آئی مگر تیسرے روز ریاض کا انتقال ہو گیا۔

فرزانہ بیوہ ہو گئی۔ زاہدہ اور فیاض یتیم ہو گئے۔ ایک رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ ایک موہوم سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ اگر زاہدہ کے بس کی بات ہوتی تو وہ روتے وقت جاوید سے لپٹ جاتی اور کہتی۔ جاوید چلو اب مجھے یہاں سے لے چلو۔ میری آخری پونجی بھی ختم ہو گئی۔ میرے بابل مجھ سے روٹھ گئے۔ اب جو کچھ ہو وہ تم ہو۔ چلو جاوید بس چلے چلو۔ اب میں بابل کے گھر ٹھہر کر کیا کروں گی" مگر زاہدہ ایسا نہ کر سکی اور خاموشی سے رو کر ہی صبر کر لیا۔

اب فرزانہ کے لئے بڑا صبر آزما اور قیامت خیز دور تھا۔ دو بچوں کی پرورش کا سوال تھا۔ کبھی وہ سوچتی کہ شادی کر لوں۔ مگر نامعلوم کیوں وہ اس ارادے پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتی۔

مگر جب اسے خیال آتا کہ بغیر روزگار کے اور بغیر کسی ساتھی کے وہ کس طرح جئے گی۔ تو وہ شادی کرنا ضروری تصور کرتی۔ تین چار ماہ گزر گئے عدت بھی گذر گئی اور وہ ایک ہزار روپے بھی کنارے پر آ لگے۔

جاوید آتا رہتا تھا۔ اس نے اظہار محبت کے دوسرے ہی دن کپڑے لا کر زاہدہ کو دے دیئے تھے۔ زاہدہ نے اس تحفہ کو لینے سے انکار بھی کیا۔ مگر جاوید بضد تھا کہ قبول کرو۔ آخر امی جی کے ڈر سے اس نے کپڑوں کو گودام والی کوٹھری میں ایک کونے میں زمین

کھود کر گاڑ دیا۔

فرزانہ کے پاس روپے ختم ہو گئے تو اس نے جاوید کو بلایا اور اپنا جھومر دے کر کہا۔

"جاوید اگر اس کی بھی پوری قیمت مل سکے تو اچھا ہے۔ اب واپسی کا وعدہ نہ کرنا۔ اب تو نہ جانے آئندہ ہماری زندگی کس طرح سے گذرے گی۔

جاوید:۔ "آپ فکر نہ کریں خالہ جان۔ مگر یہ تو بتائیے یہ جھومر کتنے کا ہوگا۔"

فرزانہ:۔ "یہ میں نے چھ تولے کا بنوایا تھا۔ حالاں کہ کل لاگت تو آٹھ سو روپے کی ہے مگر کون دیتا ہے۔ ہر کوئی صرف سونے کے دام لگاتا ہے" تم اس کو چار سو روپے تک دیدینا۔

جاوید جھومر لے کر باہر گیا اپنے بستے میں سے روپے نکالے اور جھومر اسی میں رکھا اور سات سو روپے لے کر فرزانہ کے پاس پہنچ گیا۔ جاتے ہی بولا۔

"خالہ جی آپ کی تقدیر بہت اچھی ہے جن سے پچھلے ایک ہزار روپے لئے تھے وہ اپنے بیٹے کی شادی کر رہے ہیں اور انہیں جھومر کی ضرورت تھی انھوں نے جھومر کی لاگت قیمت دے دی ہے۔ یہ لیجئے۔ سات سو روپے۔"

فرزانہ:۔ (خوش ہو کر) "بھیا تقدیر تو کہاں اچھی ہے مگر تم

بہت اچھے ہو۔ اگر فیاض بھی ہوتا تو اتنی ہمدردی نہ کر سکتا تھا۔"

زاہدہ جو جاوید سے تمام کہانی سن چکی تھی۔ جانتی تھی کہ جاوید نے اپنے پاس سے روپے لاکر دیئے ہیں اور امی جی سے بہانہ کیا ہے۔

ایک آدھ دن کے بعد جاوید نے جھومر بھی زاہدہ کو پیش کر دیا۔ زاہدہ نے کہا بھی کہ آخر آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں۔ خدانخواستہ بات آپ کے والدین پر کھل گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ مگر جاوید کہتا تھا کہ زاہدہ تمہارے لیے ہر مصیبت گوارا اور ہر قیامت منظور ہے یہ سب کچھ تمہارے لیے ہے۔ اور تمہاری خاطر تو ابھی میں نے کوئی قربانی دی نہیں ہے ذرا موقع آنے دو پھر دیکھنا کہ تمہارا جاوید کیا کرتا ہے۔ مجبوراً زاہدہ کو یہ جھومر بھی کڑوں کیساتھ ہی زمین میں دبا دینا پڑا۔

جاوید کی زیادہ آمد و رفت کو محلے والوں نے بہت زیادہ محسوس کیا اور جاوید کے والدین سے شکایت کی۔ جاوید کی اماں نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور کہا۔

"خبردار جو اب تو فرزانہ کے گھر گیا۔ وہ تو اب یہی دھندا کرے گی۔ سارا زیور تو میاں پر لگا دیا اب کیا رکھا ہے جو تین کا پیٹ پالے گی۔ بس یہی کرے گی کہ محلے والوں کو بگاڑے گی، آوارہ کہیں کی۔"

یہ سن کر جاوید کا خون کھول گیا اور بولا۔

"اماں جی میں انہیں خالہ کہتا ہوں اور کسی طرح خالہ سے کم نہیں سمجھتا کل آپ ہی ان کی بے بسی پر آنسو بہایا کرتی تھیں۔ اور آج آوارہ

کہہ رہی ہیں۔ اس عورت کو جس کی پاکیزگی پر فرشتے بھی شبہ نہیں کر سکتے۔ میں نے اپنے سوا آج تک کسی کو اس گھر کی ڈیوڑھی پر بھی نہیں دیکھا۔ کوئی اندر تو کیا جائے گا۔"

اماں:۔ میں خوب جانتی ہوں جاوید یہ بھوت سیدھی طرح اتار دو۔ ورنہ لاتوں سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آئندہ میں نے سن لیا کہ تم وہاں گئے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

جاوید:۔ اماں جی۔ آپ لاتیں نہیں تو میں لگا ئیں۔ گھر سے نکال دیجئے مگر میں وہاں جانا نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر آپ سختی سے کام لیں گی تو میں اس گھر کو چھوڑ دوں گا۔

اماں:۔ ہاں ہاں کیوں نہیں میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی۔ فرزانہ کا مولویوں سے تعویز گنڈے کرانا کوئی خالی تھوڑا ہی تھا۔ اس نے ضرور تجھے الو کا ناخن کھلایا ہے جس نے پالا پوسا۔ جوان کیا اس کو تو چھوڑ دیگا اور جس سے دو دن کی دعا سلام ہے اس سے تعلقات ختم نہ ہونے دیگا۔ دیکھ آنے دے آج اپنے باپ کو۔ جانا تو کس کا تو نے اگر نام بھی لیا تو میں جا لوں گی۔

جاوید:۔ اچھا اماں جی آپ ابا جی کے آنے سے پہلے دو باتوں کا فیصلہ اور کر لیجئے یا تو یہ ہوگا کہ میں اس گھر میں رہوں گا اور خالہ کے یہاں آنے جانے میں کوئی پابندی نہ ہو۔ اور یا میں اس گھر کو چھوڑ کر خالہ کے یہاں چلا جاؤں گا۔

جاوید کی اماں خاموش ہو گئیں ۔ انھوں نے زیادہ بیٹے سے منہ لگنے کی کوشش نہ کی اور اگر کرتیں بھی تو جاوید ہمیشہ کے لئے اس گھر کو چھوڑ دیتا۔

دوسرے دن جاوید کی اماں فرزانہ کے یہاں گئیں۔

فرزانہ :۔ آپا سلام

جاوید کی اماں :۔ ہوں ۔ سلام ۔

فرزانہ :۔ بہت دنوں بعد آج صورت دکھائی ۔ حالاں کہ اگر دیکھا جائے تو مکانوں کے درمیان ایک دیوار ہی ہے۔

جاوید کی اماں :۔ فرزانہ بات یہ ہے کہ میں عورت ہوں کچھ اور دجہ کی ۔ میں تو آج بھی نہ آتی مگر مجبوراً آنا پڑ گیا۔

فرزانہ :۔ تو وہ کون سی بات ہے ۔ جو آپ کو مجبوراً یہاں لے آئی۔ کہہ ڈالئے جلدی سے۔

جاوید کی اماں :۔ کہنا کیا تھا بی بی میرا مطلب ہے کہ تم کچھ بھی کرو مگر جاوید کو یہاں نہ آنے دو۔ آج میں نرمی سے کہہ رہی ہوں کل اگر سختی کی

ضرورت پڑی تو اس سے بھی دریغ نہ کروں گی۔

فروزاں :۔ آپا دھونس دینا کسی بچاری چھوڑے کو۔ میں جب تک خاموش رہی تو کسی سے نہ الجھی مگر جب کوئی میری طرف منہ پھاڑ کر بڑھے گا۔ تو میں بھی اس کا منہ نوچ لوں گی۔ بیوہ ہو جانے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دنیا ڈانٹ لے اور دھونس میں رکھے۔ میں کسی کو آنے کیلئے منع نہیں کر سکتی آپ جاوید کا یہاں آنا مناسب نہیں سمجھتیں تو اسے منع کر دیں۔ مگر مجھ سے یہ توقع کریں کہ منع کر دوں گی۔ تو یہ غلط ہے۔

زاہدہ بھی وہیں کھڑی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ جاوید کا آنا جانا بند ہونے والا ہے تو وہ نہ جانے کیوں گھبرا گئی۔ اور درمیان میں بول اٹھی۔ "خالہ جان آخر جاوید بھائی کے آنے میں ہرج کیا ہے جو آپ اس قدر غصے میں ہیں"۔

جاوید کی اماں :۔ بس بس لڑکی۔ زبان بند رکھ میں تجھ سے بات نہیں کر رہی ہوں۔ دو دن کی چھوکری اور گز بھر کی زبان۔ خبردار جو آئندہ مجھے جواب دیا۔

فروزاں :۔ میرا خیال ہے کہ آج آپ حد سے زیادہ گری ہوئی ہیں آپ میری بچی کو یتیم سمجھ کر ڈانٹ رہی ہیں مگر خبردار جب تک میں بیٹھی ہوں اس کی طرف کسی نے آنکھ بھی کیں تو ان انگلیوں سے اس کی آنکھیں نکال دوں گی خوب رہی ایسی آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے کہ دوسرا نظر دوں میں آتا ہی نہیں۔

جاوید کی اماں :۔ مجھے خوب معلوم ہے فرزانہ تیری کمر اب مضبوط ہو گئی ہے تو اب اکیلی نہیں ہے۔ اللہ رکھے اب تو تیرے بہت سے حمایتی بن گئے ہوں گے۔

فرزانہ :۔ بس بس اب اگر ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا بہتر یہ ہے کہ اب تم میرے گھر سے چلی جاؤ۔ میں اب ایسے لفظ کبھی سننا نہیں چاہتی۔

جاوید کی ماں فرزانہ کو انتہائی لال پیلا دیکھ کر خاموشی سے اپنے گھر چلی آئیں۔ اور شام کو اپنے شوہر سے ذکر کیا۔ خاں صاحب سن کر بڑے لال پیلے ہوئے کہ جاوید کی یہ ہمت ہو گئی ؟ اور خانصاحب نے بغیر سوچے سمجھے جاوید کو مارنا شروع کر دیا۔

جاوید نے ایک آدھ مرتبہ تو طرح دی لیکن کہا کہ دیکھئے ابا جی مجھے گستاخی پر مجبور نہ کیجئے۔ ورنہ"

ورنہ کا لفظ سن کر خاں صاحب کا ہاتھ رک گیا اور وہ غور سے جاوید کو گھورتے ہوئے بولے" ورنہ کیا ؟ بول ورنہ کیا۔

جاوید :۔ بس آج سے میرا اور آپ کا تعلق ختم۔ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔ خاں صاحب بھی غصہ میں تھے۔ اس لئے انھیں بھی احساس نہ ہوا۔ جاوید نے گھر میں جا کر بستے میں سے بقیہ رقم نکالی اور گھر سے سیدھا فرزانہ کے یہاں آیا تو فرزانہ نے کہا۔

" بیٹا جاوید آج تمہاری اماں جی آئی تھیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا اچھا

کیا۔ ہم غریب اور بے کس جس قدر سننے کے قابل تھے سن لیا، وہ اس لئے آئی تھیں۔ کہ میں خود تمہیں اپنے گھر آنے سے منع کر دوں۔ جاوید اگر تم اپنی خالہ کو طعنوں اور بدنامی سے بچانا چاہتے ہو تو......

جاوید:۔ تو یہاں نہ آیا کروں۔

فرزانہ:۔ (نظریں جھکا کر) ہاں۔

جاوید:۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آج میں گھر چھوڑ کر نکل آیا ہوں لیکن گھر چھوڑ کر ابھی آپ کے یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ ابھی میں والدین کے مخالفہ حربوں کا تنہا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا بھی ان حربوں کا زد میں آجائے۔

فرزانہ:۔ یعنی تمہارا مطلب ہے کہ تم اب گھر نہیں جاؤ گے۔

جاوید:۔ جی نہیں۔

فرزانہ:۔ نہیں نہیں ایسا نہ کرو جاوید۔ والدین چھوڑنے کی چیز نہیں ہیں تم ان سے معافی مانگ لو۔

جاوید:۔ خالہ جان میں دس مرتبہ معافی مانگ لوں۔ مگر ان کا یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ میں یہاں نہ آؤں۔ فساد کی جڑ ہے۔

فرزانہ:۔ جاوید کیا حرج ہے۔ اگر تم آنا چھوڑ دو گے تمہارے احسانات تو میں واقعی نہیں بھول سکتی۔ مگر اس کے علاوہ اب چارہ ہی کیا ہے کہ تمہیں آنے سے روک دوں۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کو اس کے والدین سے چھین لوں۔

جاوید :۔ خیر اب آپ سے کوئی مشورہ طلب نہیں کر رہا ہے۔ لیجئے یہ میری امانت اپنے پاس رکھ لیجئے۔ (ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے)

فرزانہ :۔ یہ کیا ہے ؟

جاوید :۔ یہ روپے ہیں

فرزانہ :۔ کہاں سے آئے اتنے روپے۔

جاوید :۔ خالہ جان آپ پوچھ گچھ نہ کریں بلکہ خاموشی سے رکھ لیں۔

فرزانہ :۔ مگر جاوید میں پھر پوچھتی ہوں یہ آئے کہاں سے۔

کہیں سے بھی آئے خالہ جان۔ میں ڈاکہ مار کر لایا ہوں میں نے چوری کی ہے قتل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں آپ امانت رکھ لیں آپکو انکار کیوں ہے۔

میں اس لئے ڈرتی ہوں کہ خدا نخواستہ کل کو کوئی بات ہوگی۔ تو لوگ مجھے ہی پکڑیں گے کہ اس نے جاوید کو غلط ترغیب دی ہوگی۔

اچھا اگر یہ بات ہے۔ تو میرے احسانوں کے بدلے میں آپ یہ بھی گوارا کر لیں۔

فرزانہ نے وہ رقم اپنے صندوق میں رکھ لی۔ اور جاوید چلا گیا۔

جاوید شہر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آکر ٹھہر گیا اور گھر نہیں گیا رات کے جب نو بج گئے اور وہ گھر نہ پہنچا تو اب اس کے والدین بڑے پریشان ہوئے کہ بیٹا کہاں گیا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ مرادوں اور ارمانوں کا۔ جاوید کی ماں نے رونا شروع کر دیا خانصاحب نے پریشان ہو کر سارا شہر چھان مارا مگر جاوید کا پتہ نہ چلا۔ آخر رات کو بارہ بجے کے قریب اس کی

اماں فرزانہ کے پاس آئیں اور روتے ہوئے کہنے لگیں "بہن میرا قصور معاف کردو اور مجھے جاوید کا پتہ بتا دو"

فرزانہ :۔ جاوید میرے پاس شام کو آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں اب گھر نہ جاؤں گا۔ اور نہ آپ کے یہاں آؤں گا۔ بلکہ جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں گا۔ مجھ سے چاہے جیسی قسم لے لو جو پتہ بتا کر گیا ہو۔

جاوید کی اماں نے بہت پھیر دے دیکر معلوم کرنا چاہا مگر جو حقیقت تھی وہ اپنی جگہ قائم رہی۔ اور جاوید کا پتہ نہ چل سکا۔ مجبوراً جاوید کی اماں نے گھر آکر تمام ماجرا خاں صاحب سے کہا۔ خانصاحب کو غصہ آگیا اور وہ یہ سمجھے کہ فرزانہ کو سب کچھ علم ہے مگر وہ بتانا نہیں چاہتی۔ اس لئے خاں صاحب نے فوراً پولیس اسٹیشن کی راہ لی۔ داروغہ جی کو کچھ دے دلاکر اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فرزانہ پر سختی کریں۔ داروغہ جی تین چار سپاہیوں کو لے کر فرزانہ کے گھر آدھمکے فرزانہ نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ تو داروغہ جی نے چہرے پر جھریاں ڈالتے ہوئے کہا،

"اری سچ سچ بتا دے کہ جاوید کہاں ہے۔ ورنہ ابھی لے جاکر حوالات میں بند کردوں گا اور وہ مار لگواؤں گا کہ ہڈیاں گرم ہوجائیں گی۔"

فرزانہ :۔ داروغہ جی میرا جو جواب پہلے تھا سو اب بھی ہے مجھے بالکل علم نہیں کہ جاوید کہاں ہے،

داروغہ جی :۔ ابے لوکی بیٹھی سیدھی طرح بتا دے ورنہ چوٹی پکڑ کر ایسے طمانچے رسید کروں گا کہ دماغ ٹھکانے ہوجائیگا،

فرزانہ کو پولیس کی اس سختی سے اختلاج ہو رہا تھا مگر پھر بھی اس نے سخت ہو کر کہا۔

"داروغہ جی اب منہ سے ایک گالی نہ نکلے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں بھی عزت دار ہوں بیوہ ہوں تو کیا ہوا۔"

داروغہ:۔ (دانت پیستے ہوئے) تو بیوہ ہے یا تیجانی۔

فرزانہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اس نے غصہ سے دروازہ بند کر لیا۔ اور کہہ دیا۔

"داروغہ جی جائیے آپ سے جو ہو سکے کر لیجئے۔"

بھلا پولیس والا یہ حکم سن سکتا تھا۔ فوراً سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ دروازہ توڑ دو۔ حکم کی دیر تھی فوراً دروازے کی چولیں توڑ ڈالیں داروغہ جی گھر میں داخل ہو گئے۔ فرزانہ کو حکم دیا کہ وہ تھانے چلے۔

فرزانہ رونے لگی۔ داروغہ جی کی خوشامد بھی کی مگر کون سنتا تھا اس کی مجبوراً سپاہیوں کے ساتھ وہ تھانے کی طرف چلی اور زاہدہ سے کہہ گئی کہ وہ بالکل نہ گھبرائے اور فیاض کی خبر گیری رکھے۔ جب فرزانہ کو تھانے لے جایا جا رہا تھا۔ تو کافی تماشائی بھی ساتھ ہو گئے تھے۔

اس طرح سڑک پر کافی بھیڑ اور شور کی آواز تھی یہ تمام مجمع کارونیشن کوین ہوٹل کے نیچے سے ہو کر گزرا جس میں جاوید ٹھہرا ہوا تھا۔ آج جاوید کی نیند ویسے بھی اڑی ہوئی تھی۔ اس نے لوگوں کا شور سنا تو چھجے پر آ گیا دیکھا تو آگے آگے اس کے والد اور پیچھے سپاہیوں کے نرغے میں ایک

عورت اور پھر تماشائی چلے آرہے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ سارا غصہ فرزانہ پر اتر گیا۔ اس نے فوراً یہاں آکر زاہدہ سے تصدیق کی زاہدہ جاوید سے لپٹ کر رونے لگی۔

جاوید نے تسلی دی اور کہا کہ تم دیکھتی رہو۔ انشاءاللہ ابھی خالہ جان کو لے کر آتا ہوں۔ وہ سیدھا اپنے ایک ہم جماعت دوست سعید کے پاس پہنچا۔ جس کے باپ وحید الحسن وہاں کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ رات کے ایک بجے سپاہی نے منع کر دیا کہ تم اندر نہیں جا سکتے۔ اور نہ کسی کو جگا سکتے ہو۔ مگر جاوید نے سپاہی سے اس قدر زور زور سے بات کرنی شروع کر دی کہ اندر کے سب لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً ہی سعید باہر نکلا تو دیکھا کہ جاوید کھڑا تھا۔ جاوید نے معاملہ بتایا۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب بھی باہر نکل آئے۔ سعید نے اپنے ڈیڈی کو بتایا کہ یہ جاوید میرا ہم جماعت ہے اور اچھا دوست ہے۔

جاوید نے سارا قصہ ڈپٹی صاحب کو بتایا اور کہا کہ داروغہ جی زبردستی زنانے گھر میں گھس کر ابھی تھانے لیکر گئے ہیں ڈپٹی صاحب کو بہت غصہ آیا۔ اور اسی وقت جاوید کو ساتھ لیکر تھانے پہنچے۔ تو داروغہ جی نے فرزانہ کو حوالات میں بند کر رکھا تھا اور خود گالیاں دے دیکر واقعات پوچھ رہے تھے۔ فوراً ڈپٹی صاحب اندر پہنچ گئے۔ سارا تھانہ "اٹینشن" ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب نے آتے ہی پوچھا کہ تم نے اس عورت کو کس طرح اور کس جرم میں گرفتار کیا ہے اور حوالات میں کس وجہ سے

بند کیا ہے۔

داروغہ کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا۔ حضور حضور کر کے رہ گیا۔

ڈپٹی صاحب نے فوراً داروغہ جی کو معطل کر دیا۔ فرزانہ سے معافی مانگی اور جاوید کے والد سے کہا۔

" اگر اب آپ نے ناجائز طریقے اختیار کرنے کی کبھی کوشش کی تو یاد رکھئے کہ اس حوالات میں آپ بند ہوں گے۔"

ڈپٹی صاحب نے جاوید کی طرف دیکھا تو جاوید ممنون ہو کر بولا۔

" میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں مگر ایک بات اور معلوم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں اگر ان کے (فرزانہ کی طرف اشارہ کر کے) یہاں رہنا شروع کر دوں تو کیا کوئی قانونی جرم مجھ پر عائد ہو سکتا ہے۔"

ڈپٹی صاحب :۔ نہیں تم بالغ ہو اور جہاں چاہو وہاں رہ سکتے ہو۔

اس کے بعد ڈپٹی صاحب چلے گئے جاوید بھی اپنی خالہ جان کو لے کر گھر چلا۔ خان صاحب گردن جھکائے جاوید کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ آدھا راستہ گذر جانے کے بعد بولے۔

" بیٹا اگر تم اپنی خالہ جان کو اسی قدر چاہتے ہو اور ان پر اسی قدر مہربان ہو تو میری طرف سے اجازت ہے کہ آیا جایا کرو مگر خدا کیلئے اپنا گھر نہ چھوڑو اور اپنے ماں باپ کو پریشان نہ کرو۔"

جاوید :۔ اباجی اگر یہ بات آپ خالہ جان کی اتنی بدنامی ہونے سے

پہلے سوچ لیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ اب جبکہ میں ہر منزل سے گزر چکا ہوں چاہے کہیں بھی رہوں،

خاں صاحب: میں تمہاری خالہ سے معافی چاہتا ہوں، واقعی مجھ سے غلطی ہوئی،

فرزانہ: ایک بیوہ کے سفید دوپٹے کو سر بازار گھما کر آپ معافی مانگ رہے ہیں۔ ایک بے یار و مددگار کو پولیس کی مخش گالیاں سنوا کر آپ پچھتا رہے ہیں، یتیم اور معصوم بچوں کو آدھی رات کو ستا کر آپ پشیمان ہو رہے ہیں، بہر حال کوئی بات نہیں، میرے زخموں کا مرہم صرف قدرت کے پاس ہے آپ کے پاس نہیں،

خان صاحب ان جملوں سے اس قدر شرمندہ ہوئے کہ دوبارہ جاوید سے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ گھر آئے گا یا نہیں،

جاوید نے بھی گھر جا کر فرزانہ سے معافی مانگی اور کہا کہ یہ ساری مشکلات اور آفتیں محض میری وجہ سے آپ پر آئیں، مگر فرزانہ بولی "نہیں نہیں جاوید تم نے تو اس وقت مجھے ظالموں کے چنگل سے چھڑایا ہے اور پھر تم حق پر ہو اس لئے میں ہر تکلیف اٹھا کر بھی تمہارے ساتھ ہوں اچھا اب گھر جا کر سو جاؤ اور اگر چاہو تو یہیں سو رہو۔ اور جاوید اس رات وہیں سو گیا،

صبح ہوتے ہی جاوید کی اماں فرزانہ کے یہاں آپہنچیں، فرزانہ آگ سلگا رہی تھی، زاہدہ آٹا گوندھ رہی تھی، فیاض اور جاوید سو رہے تھے۔ جاوید کی اماں نے آتے ہی بڑے خلوص اور پیار سے فرزانہ کو سلام کیا فرزانہ نے گردن سے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا، وہ بیٹھ گئی، اور پیار سے کہنے لگی،

"بہن خدا ایک ہے اور رسول برحق ہے، صبح کا وقت ہے جانماز پر بیٹھی ہوں، اگر یقین کرو تو کہوں کہ رات کی بات پر مجھے جس قدر صدمہ ہے اپنے سگے کے مرنے پر بھی نہ ہوتا، میں نے جاوید کے ابا کی جس قدر خبر لی ہے بس خدا ہی جانتا ہے مجھے تو رات بھر نیند بھی نہ آئی صبح ہوتے ہی میں نے سوچا کہ پہلے میں اپنی بہن سے معافی مانگ لوں اسی لئے آئی ہوں، فرزانہ خدا کے لئے اب تو مجھے معاف کر دو"۔

فرزانہ: . آپا معافی تو بھول کی ہوتی ہے، جو کام قصداً کیا جائے اس کی معافی کیا جب تم نے ہر حربہ اختیار کر لیا، میری بے عزتی کر

چکیں۔ مجھے سر بازار رسوا کر لیا تو معافی مانگنے لگیں۔ اس معافی سے کیا فائدہ۔ اور پھر میں کون سا بدلہ لے رہی ہوں۔ جو اس کی تم کو ضرورت پڑی میرا فیصلہ تو خدا کریگا۔

جاوید کی اماں :۔ بہن فرزانہ بس میری زبان گنگ ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب تم کچھ ہی سمجھو میں واقعی خطا وار ہوں۔ اسی گفتگو کے دوران میں جاوید کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آگیا اور کہنے لگا۔

" اماں جی کیا اب کوئی نیا داؤ کھیلنے لگی ہو "

اماں :۔ بیٹے تو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہے تو نہیں لیکن تجھے اپنا خون پلا کر پالا ہے اور آج تو ہی میرا خون ڈکار کر کھینچ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے دودھ نہ بخشا تو اللہ میاں تجھے معاف نہ کریگا۔

جاوید :۔ آپ کا احسان سر آنکھوں پر حالانکہ آپ نے اماں جی یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ ہر ایک اپنی اولاد کو پالتا ہے اس کے باوجود بھی اگر آپ کو میری جان کی ضرورت ہے تو آپ کے قدموں پر نثار کر دوں گا۔ مگر خدا کے لئے یہ مت بھولئے کہ آپ کے اکلوتے بیٹے کے پاس بھی ایک انسانی دل ہے۔ جس میں درد ہے اور رحم بھی۔

اماں :۔ بیٹا بس اب میری عقل بھی ٹھکانے آگئی ہے چل اب گھر چل۔ یہ گھر بھی تیرا ہے اور وہ گھر بھی۔

جاوید :۔ اب تو اماں جی میں خالہ جان کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔

فرزانہ :۔ نہیں جاوید میاں میری طرف سے تمہیں پوری پوری اجازت ہے ۔ میں کسی ماں سے اس کی اولاد چھین کر کلیجہ پر زخم ڈالنا نہیں چاہتی۔ یہ تمہاری ماں ہیں اور ان کے پیروں تلے تمہاری جنت ہے تم ضرور جاؤ۔ مگر ناشتہ تیار ہے۔ ناشتہ کر کے جانا ۔

جاوید کی اماں :۔ ہاں ہاں فرزانہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے ۔ جو ناشتہ بھی نہ کریں۔ مگر خیال یہ ہوتا ہے کہ تو دکھیا ہے آمدنی کوئی ہنیں ۔ خاطر میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔

فرزانہ :۔ یہ تو صحیح ہے آپا مگر ابھی تو ایک آدھ زیور کا سہارا ابھی باقی ہے اور پھر میں کوئی کام بھی شروع کرنے والی ہوں ۔ سوچ رہی ہوں کہ کپڑا بیچا کروں ۔

جاوید کی ماں :۔ ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے فرزانہ لوگوں کی انگشت نمائی سے بچ جاؤ گی ۔

جاوید :۔ (مسکرا کر) اجی لوگ تو ایک طرف رہے بس آپ کی انگلیوں سے محفوظ رہیں ۔

اماں :۔ دیکھ جاوید تو بہت منہ پھٹ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بولا کر۔

اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب نے مل بیٹھکر ناشتہ کیا اور پھر جاوید اور اس کی ماں اٹھکر گھر چلے گئے۔ گھر خانصاحب کے صرف اتنا کہا ۔ جاوید! تمہیں معلوم ہے کہ تم اکلوتے ہو اور ہمارے پاس جو کچھ ہے۔

رہ تمہارا ہے اگر تم جان بوجھ کر اپنے ورثے پر لات مارو تو کہاں تک مناسب ہے ۔

جاوید :۔ اباجی آپ کا فرمانا تو درست ہے مگر ہزار تلخی بکلیفیں اٹھا کر مجھے ورثہ ملا تو کیا ملا ۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرے اکلوتے پن کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا جاتا ۔

خاں صاحب :۔ یہ تمہارا خیال ہے بیٹا ۔ تھوڑی دیر بعد خان صاحب تو چلے گئے ۔ اب جاوید اور اس کی اماں رہ گئیں جاوید نے کہا "اماں جی اب اگر دل میں کوئی بات نہ ہو اور غصہ اتر گیا ہو تو ایک بات کہوں ۔

اماں :۔ کہو بیٹا تم سے غصہ کس کو ہے ۔

جاوید : اماں جی میں چاہتا ہوں کہ آپ زاہدہ کو اپنی بہو ۔ ۔ ۔ ۔

اماں :۔ بس بس لڑکے زبان بند کر ۔ ردبٹوں کی محتاج لڑکی میری بہو نہیں بن سکتی ۔ پاگل میں تو تیرا ایسی جگہ بیاہ کروں گی جہاں سے بہو سونے میں لدی ہوئی آئے گی ، اور اس قدر جہیز لائیگی کہ گھر میں رکھنے کو جگہ بھی نہ رہے گی ۔

جاوید :۔ اماں جی آپ پھر اسی انداز سے بات کر رہی ہیں جو میرے دل میں نشتر بن کر چبھتی ہے ۔ شادی میری ہوگی ۔ میں چاہے پیسے والی سے کروں چاہوں بھکارن سے بیاہ کر لوں ۔

اماں :۔ اگر بیٹا تیرا یہ ارادہ ہے تو اپنی ماں کے جنازے پر بارات لے جانا ۔

جاوید :- اچھی اماں جی آپ ایسی باتیں نہ کیجئے اگر مجھے میری ماں ہی خوشیاں نہ دے سکے گی تو کون دے گا، میں اپنی ہر خوشی اپنی ماں کے توسل سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اچھی اماں مان جایئے۔

اماں :- میرے چاند میں تیرے قربان۔ تیری خوشی کے لئے میں جان بھی دیدوں گی، مگر تو ایسی باتیں نہ کر جس سے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے

جاوید :- اماں جی کیا خاندان کی عزت اسی بات سے قائم ہے کہ روپیہ سود پر چلایا جائے غریبوں کا زیور اونے پونے پیسوں میں گروی رکھ کر ہضم کر لئے جائیں، اگر اسی کا نام خاندانی عزت ہے تو مجھے آپ اپنا بیٹا بھی نہ کہیں میں خود کو لاوارث کہلوانے کو تیار ہوں۔ مگر میں سود خور اور ظالم والدین کی اولاد مشہور ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اماں :- تیرے سر پر بھوت ناچ رہا ہے تیری قسمت تجھے تباہی کی طرف لے جا رہی ہے تو بار بار سود کا نام لیکر مجھے چڑانے کی کوشش کر رہا ہے میں تو کیا جواب دوں اپنے ابا کو آ جانے دے وہ تجھے جواب دیں گے۔

اسی دوران میں خان صاحب بھی گھر میں آ گئے اور باتیں از سر نو شروع ہو گئیں خان صاحب نے بھی کسی طرح تسلیم نہ کیا کہ جاوید کی شادی زاہدہ سے کر دی جائے آخر جاوید نے پھر قطعی فیصلہ کر لیا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو میں ہمیشہ کے لئے اس گھر کو چھوڑ دوں گا۔

اس مرتبہ خاں صاحب نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا کہ جاوید اس گھر کو بالکل چھوڑ دے۔

جاوید وہاں سے فرزانہ کے گھر آکر خاموش بیٹھ گیا فرزانہ نے خاموشی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہہ دیا کہ پھر بات بڑھ گئی اور ابا جی نے گھر میں رکھنے سے انکار کردیا اور میں یہاں چلا آیا۔

فرزانہ نے کہا "جاوید یہ تو ہر وقت کی جلن ہوگئی تم نے خواہ مخواہ اپنے دل کو پریشانیاں لگا رکھی ہیں تم ایک بات پر قائم رہو جاؤ یا نور الدین کو اپنا لو۔ کیوں کہ یہ ان کا پہلا حق ہے اور اگر ان سے کسی طرح نبھنی مشکل ہو تو اس گھر کو اپنا گھر بنا لو۔

جاوید:۔ بس اب میں کسی قیمت پر گھر واپس نہ جاؤں گا اور کل میں رمضان والی دوکان خرید کر اس پر بیٹھا کروں گا۔

فرزانہ:۔ یہ اور بھی اچھا خیال ہے مگر تم نے تو دسویں کا امتحان دیا ہے۔ انشاء اللہ پاس بھی ہو جاؤ گے تو تم سرکاری نوکری کرنا۔

جاوید:۔ اجی خالہ جان سرکاری نوکری میں کیا ملے گا "اونچی دوکان پھیکا پکوان" والا حساب ہے مشکل سے سو روپے ملیں گے۔ سو روپے میں تو ایک آدمی کی گذر مشکل ہے آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ جتنے سرکاری ملازم ہیں ان میں سے کوئی بھی خوش حال ہے؟ سب پر افلاس طاری ہے اور دوکانداری کا تو یہ ہے کہ اگر گرے سے گرا بھی منافع ہوا تو پانچ چھ روپے روز کہیں نہیں گئے۔

فروزانہ:۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے اچھا تو تم دوکان ہی کر لو۔

دوسرے ہی دن جاوید نے رمضان خاں والی دوکان ڈیڑھ ہزار روپے میں خرید لی مال اس میں تھا ہی نہیں جاوید نے ایک ہزار کا مال خرید کر دوکان میں بھر دیا اور اللہ کا نام لے کر دوکان پر بیٹھ گیا۔

دوکان موقع کی تھی چل نکلی اور جاوید کو پندرہ بیس روپے روزانہ کی بچت ہونے لگی وہ تمام روپیہ وغیرہ زاہدہ ہی کے پاس رکھتا تھا، اور زاہدہ ہی روزانہ اس سے حساب لیتی تھی۔ کہ جاوید بھیا آج کتنی بکری ہوئی اور کیا بچت ہوئی لاؤ روپے اور جاوید سارا حساب سمجھا کر روپے زاہدہ کو دیدیتا۔

اتوار کے دن دوکان بند رہتی تھی فیاض اور زاہدہ سو رہے تھے دوپہر کا وقت تھا، فرزانہ نے کھانا لا کر دیا تو جاوید بولا۔

"خالہ جان میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں مگر زبان پر آکر رک جاتی ہے،

فروزانہ:۔ جاوید تمہیں تو اب تکلف سے کام نہیں لینا چاہیئے جب گھر ہی تمہارا ہے تو کہنے میں تامل کیوں ہے،

جاوید:۔ کہیں آپ خفا نہ ہو جائیں،

فروزانہ:۔ میں اور تم سے۔

جاوید:۔ اچھا تو وعدہ کیجئے کہ اگر وہ کام نہ کیا تو خفا بھی نہ ہوں گی،

فرزانہ کو جملوں کی نوعیت سے ایک مرتبہ تو پسینہ ہی آگیا مگر وہ پھر دل کو سمجھاتے ہوئے بولی " کہہ ڈالو جاوید "

جاوید نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا " خالہ جان زاہدہ.... "

فرزانہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیوں کہ اس کو اپنے متعلق غلط فہمی ہو رہی تھی ۔ فرزانہ نے مسکرا کر کہا ۔ تمہارے لئے اولاد تو کیا دنیا کی ہر چیز قربان کر سکتی ہوں ، مگر سوال پھر وہی ہے ،

جاوید :۔ خالہ جان کون سا سوال ،

فرزانہ :۔ بس تمہارے والدین کی مرضی ،

جاوید :۔ خالہ جان بس والدین کا تو آپ ذکر ہی نہ کیا کریں ۔ جب میں نے تمام کام اپنے پیروں پر شروع کر دیئے ہیں تو پھر کسی کی اجازت کیسی ،

فرزانہ :۔ تمہاری مرضی ہے ۔ زاہدہ تمہاری ہے ،

جاوید سے پوری طرح کھانا بھی نہ کھایا گیا اور وہ پھر بولا " خالہ جان تو بس اگلا اتوار مقرر کر دیجئے ،

فرزانہ :۔ اس میں مقرر کرنے کی کیا بات ہے کچھ دینے کو تو ہے نہیں ۔ جو تھوڑے بہت زیور تھے وہ بھی برابر ہو گئے بلکہ اب تو میں اور فیاض بھی تم پر بار ہو گئے ،

جاوید :۔ خالہ جان اگر آپ کے زیور آپکے پاس ہوتے تو کیا آپ زاہدہ کو دیدیتیں ،

فرزانہ:۔ بھلا مجھے کیا انکار تھا رکھے ہی تھے اسی کے لئے۔

جاوید نے انتہائی خوشی کے عالم میں زاہدہ کو آواز دی" زاہدہ! زاہدہ، اٹھو تو"

زاہدہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور قریب آ کر کہنے لگی۔

"کیا بات ہے"

جاوید:۔ ذرا میری امانت تو لے آؤ۔

زاہدہ ایک دم کھسیانی سی ہوگئی اور تذبذب میں پڑ گئی۔ کہ کہیں ماں کے سامنے سارا بھانڈہ نہ پھوٹ جائے،

جاوید نے پھر کہا" تم امی سے نہ گھبراؤ۔ اور میری امانت جو میں نے تمہارے سپرد کی تھی لے آؤ۔"

زاہدہ سہمی کوٹھری میں گئی اور وہ زیورات نکال کر لے آئی جو جاوید نے رکھوائے تھے۔ وہ زیور لے کر جاوید نے فرزانہ کو دیتے ہوئے کہا" لیجئے دیدیجئے اپنی بیٹی کو۔"

فرزانہ:۔ جاوید یہ کیا معمہ ہے یہ زیور تو فروخت ہو چکے تھے۔۔۔۔۔

جاوید:۔ ہاں! مگر میرے ہاتھ فروخت ہوئے تھے۔

فرزانہ:۔ "تمہارے ہاتھ" ؟

جاوید:۔ ہاں اس کی قیمت میں نے ادا کی تھی اسی امانت میں سے جو کچھ دن آپ کے پاس رہی اور جس سے اب دوکان چل رہی ہے۔

فرزانہ نے دوبارہ تعجب سے پوچھا "مگر جاوید یہ تو بتاؤ کہ روپیہ آیا کہاں سے؟"

"میرا ہے میرے باپ دادا کا ہے"۔

"میں مطلب نہیں سمجھی تم صاف صاف کہو"۔

"صاف کیا کہوں خالہ جان ہمارے یہاں جو چوری ہوئی تھی وہ اسی خاکسار کی سعی کا مگار تھی۔ بس اب حیل وحجت کی ضرورت نہیں ہے، یہ زیورات اپنی بیٹی کو دیدیجئے"۔

فرزانہ نے عجیب نظروں سے جاوید کو دیکھا اور زاہدہ کو مسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور زیور دیتے ہوئی بولی۔

"لو بیٹی خدا تمہیں مبارک کرے"

زاہدہ ایک ان جانے جذبے کے تحت شرم سے پانی پانی ہو گئی اور منہ پہ ہاتھ رکھکر وہاں سے بھاگ گئی اور باورچی خانے میں جاکر دروازہ بند کرلیا اور شام کو جب تک جاوید باہر نہ چلا گیا، اس نے دروازہ نہ کھولا۔ شادی کی تیاری شروع ہو گئی سب سے پہلے جاوید نے اپنے اباجی کو خط لکھا۔

پیارے اباجی

آداب،

آپ کے بیٹے کی شادی آنے والے اتوار مورخہ ۲۴ مئی کو ریاض الدین صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر زاہدہ

پرودین سے طے پا چکی ہے۔

اگر آپ کے دل میں اولاد سے ذرا بھی محبت ہے تو یقیناً یہ شادی آپ ہی کے دستِ انتظام سے انجام پائے گی ورنہ ایک بدنصیب بیٹا اپنے والدین کی شرکت کے بغیر ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔

آپ کا اکلوتا فرزند

جاوید

یہ خط جاوید کے والدین کے لئے عجیب سوہانِ روح بن گیا۔ کبھی تو وہ سوچتے کہ قطعی شرکت نہ کریں اور کبھی خیال کرتے کہ جلو اب وہ جانے شرکت تو کر ہی لیں۔ جاوید کی ماں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور خانصاحب بھی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ آخر یہ طے پایا کہ خانصاحب شرکت نہیں کریں گے۔ اور اتوار کو زاہدہ کی شادی جاوید کے ساتھ ہو گئی اتوار کو خانصاحب معہ اہلیہ کے کہیں شہر سے باہر چلے گئے۔

زاہدہ کی شادی کے بعد فرزانہ کے کاندھوں سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا مگر وہ اس خیال سے خاموش رہنے لگی کہ داماد کی کمائی پر کیسے جئے۔ اسی لئے اس نے بہتر سمجھا کہ کسی سے شادی کر لے اور فرزانہ نے اپنا یہ ارادہ محلے کی ایک دو ملنے والیوں کے بھی گوش گزار کر دیا۔ تاکہ اسے کسی رشتہ کے ملنے میں دقت نہ ہو مثل مشہور ہے کہ "زبان سے نکلی کو ٹھے پر چڑھی"۔ تقریباً یہ بات محلے کی تمام عورتوں اور مردوں میں پھیل گئی کہ فرزانہ کا شادی

کرنے کا ارادہ ہے جب یہ خبر قاسم حسین نے سنی تو خوشی سے اچھل پڑا۔ قاسم حسین کی عمر اس وقت چھبیس ۲۶ سال کی ہوگی وہ آج سے آٹھ سال پہلے ریاض کی دوکان پر ملازم تھا اور اکثر دوپہر کا کھانا لینے گھر آیا کرتا تھا اس نے فرزانہ کو کئی مرتبہ دیکھا تھا اور اکثر ایسی حرکتیں بھی کر چکا تھا جس سے اس کی نیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ بلکہ ایک دن تو قاسم نے کہدیا "کہ بی بی جی آج تو آپ ماشاء اللہ بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے" اور اسی دن فرزانہ نے ریاض الدین سے کہکر قاسم کو نوکری سے علیحدہ کروادیا تھا۔ قاسم یوں تو پہلے ہی بگڑا ہوا تھا۔ ملازمت چھوٹ جانے سے اور بھی ننگ ہوگیا۔ بدمعاشوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ شراب پینے لگا اور طوائف بازی تو اس کا ضروری شغل ہوگیا تھا۔ نام کے لئے ایک سائیکلوں کی دوکان کھول رکھی تھی۔ گو آمدنی تو معقول تھی مگر کبھی دل جما کر نہ بیٹھا اور نوکروں پر ہی اکتفا کی بہرحال قاسم نے جب سنا کہ فرزانہ شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کے دل میں آٹھ سال کا پرانہ جذبہ از سر نو پیدا ہوگیا اور اس نے فرزانہ سے شادی کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنی شروع کر دی ؎

قاسم نے اپنے ایک دوست کی بیوی نوری کو پیغام دے کر فرزانہ کے گھر بھیجا۔ اب سب سے بڑی مشکل جو تھی وہ یہ کہ اس پیام و سلام کے سلسلے میں کس سے بات چیت کی جائے۔ براہِ راست فرزانہ سے گفتگو کرنا مناسب نہ تھا۔ زاہدہ سے تذکرہ کرنا بھی بے حجابی اور غیرت پر محمول تھا جاوید سے بات کرنے کی نوری میں ہمت نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر نوری نے فرزانہ ہی سے کہا۔

نوری:۔ "بہن فرزانہ میں ایک پیام لے کر آئی ہوں"۔

فرزانہ شرما گئی مگر ماحول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بولی۔

"کس کا ہے؟"

نوری:۔ "قاسم حسین کا"

فرزانہ: کون "قاسم حسین"؟

نوری:۔ ارے وہی قاسم حسین ہیں جن کی بڑی سڑک پر سائیکلوں کی دوکان ہے چار چار نوکر کام کر رہے ہیں شہر میں سب سے اچھا کام

ہے۔ اور پھر وہ بچپن میں تمہارے یہاں کام بھی تو کر چکے ہیں،

فرزانہ سمجھ گئی اور خاموش سی ہو گئی اس کے ذہن میں قاسم کی وہی پچھلی باتیں چکر لگانے لگیں۔

"بی بی آج تو ماشاءاللہ بڑی اچھی لگ رہی ہو، کسی کی نظر نہ ہو جائے آپ کو۔"

یہ جملہ اس کے ذہن میں بار بار چکرانے لگا فرزانہ نے سوچا، رشتہ تو اچھا ہے وہ مجھ سے پہلے سے ہی محبت کرتا ہے جبھی تو میرے حسن کی تعریف کیا کرتا تھا، اور میں نے اسی بات پر تو اسے ملازمت سے علیحدہ کروا دیا تھا، اس کے دل میں اب تک میرے لئے جگہ ہے مجھے لازمی اس سے شادی کر لینی چاہئے۔ ایک تو وہ مجھے چاہتا ہے اور دوسرے وہ میرے یہاں ملازم رہ چکا ہے تو اس بات سے دبا بھی رہے گا۔ اس رشتہ کو منظور کر لینا ہی اچھا ہے" نوری کے دوبارہ پوچھنے سے وہ چونک سی پڑی، اور کہنے لگی۔

"بہن قاسم کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے تو باقی زندگی کے دن گزارنے ہیں وہ کسی کے ساتھ گزر جائیں مجھے منظور ہے،

نوری نے قاسم کو بتا دیا کہ فرزانہ کو رشتہ منظور ہے اب قاسم نے فوراً شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے جاوید سے بات چیت کی۔

جاوید حیران رہ گیا کہ قاسم کیا کہہ رہا ہے مگر جب اس نے تفصیل بتائی

تو جاوید کو یقین سا آ گیا۔ پھر بھی جاوید نے کہا کہ میں بغیر اپنی ساس سے گفتگو کئے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جاوید گھر آیا تو اس نے پہلے زاہدہ سے کہا کہ "تمہاری والدہ نے قاسم حسین سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے مگر وہ تو زمانے بھر کا آوارہ ہے اس کی زندگی کے آدھے دن تو جیل میں کٹتے ہیں کتنی ہی مرتبہ نشے میں بے ہوش ہو کر نالیوں کے تختوں اور نالیوں پر پڑا ہوا دیکھا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالہ کو شادی کی کیا ضرورت ہے بھلا میرے پیسوں کو غیر کیوں سمجھتی ہیں۔

زاہدہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئی۔ اور کہنے لگی،

"مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ امی جان کو واقعی ایسے آدمی سے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ اصل میں وہ اس لئے پریشان ہیں کہ داماد کے پیسے پر کس طرح زندگی گزاریں"

جاوید نے بڑی ہمت کی اور فرزانہ کے پاس پہنچا اور کہا "خالہ جان آج مجھے قاسم حسین ملے تھے"

فرزانہ کو پسینہ سا آ گیا۔ پھر وہ بولی "کیا کہتے تھے"

شادی کی تاریخ طے کرنے کو کہہ رہے تھے مگر میں نے کہہ دیا کہ بغیر پوچھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

فرزانہ نے منہ دوسری طرف کر لیا اور کہنے لگی "تم ان سے خود جو تاریخ مناسب سمجھو طے کر لو"

مگر خالہ جان کیا مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت ہے۔"

ہاں ہاں کہو۔ مگر تم شاید یہی کہو گے کہ تو یہ شادی کیوں کر رہی ہے۔ تو بڑھاپے میں کیوں پاگل ہو گئی ہے تیرا دماغ کیوں خراب ہو گیا ہے۔" "میں گستاخی تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور پوچھوں گا کہ آپ شادی کرنے پر اس قدر کیوں آمادہ ہیں۔"

"جاوید میاں اب تم سے میرا رشتہ ایسا بندھ گیا ہے کہ ساری عمر نظریں نہیں اٹھا سکتی۔ تمہارا یہ احسان ہی کس قدر بڑا ہو گا کہ تم میری زاہدہ کو خوش رکھو۔ میں کس طرح یہ برداشت کر لوں کہ فیاض کا اور میرا خرچ بھی تمہارے کندھوں پر پڑے۔ میں خود ہی فیاض کی اور اپنی کفالت کرنا چاہتی ہوں۔"

جاوید نے بڑی متانت سے اور غم زدہ انداز میں کہا۔

"خالہ جان آپ ذرا سی بات کے لئے ایک بڑی قیامت اپنے ذمہ لے رہی ہیں آخر دنیا میں بے چاری دلہا دارث ساس کا داماد کے گھر رہنا اور اس کے ذمہ سے کھانا کہاں کا گناہ ہے۔ اگر آپ صاحب حیثیت ہوتیں اور پھر میرے ہاں سے کھاتیں تو ایک بات بھی تھی۔ اگر دنیا داماد کے گھر کو ساس کے لئے غیر ضروری سمجھتی ہے۔ اور اس کے ساتھ زندگی گذارنا نامناسب قرار دیتی ہے تو یہ دنیا پاگل ہے مجھے دنیا کے اس اصول سے نفرت ہی نہیں بلکہ بغاوت ہے میں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ آپ ذرا سی بات کے لئے پورے

خاندان کو خطرے میں ڈال دیں۔ قاسم حسین کے متعلق اتنا آپ نہیں جانتی جتنا کہ میں جانتا ہوں۔ وہ شہر کا سب سے زیادہ اوباش آوارہ، شرابی اور زانی ہے۔ کیا آپ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو، اپنے فیاض کو اور اپنی بیٹی کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دینے کو تیار ہیں۔

فروزاں :۔ تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہے مگر مجھے اپنے آپ پر پورا پورا اعتماد ہے کہ میں اسے راہ راست پر لے آؤں گی۔ جو آج شہر کا مشہور آوارہ ہے۔ وہ کل نیک گرہستی بھی بن سکتا ہے۔

جاوید :۔ میں آپ کے سامنے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر آپ نے تہیہ ہی کر لیا ہے تو میں آپ کا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ میرا کام آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دینا تھا۔

فروزاں :۔ میں خود بھی اس کو محسوس کرتی ہوں۔ لیکن جس وجہ سے میں نے شادی کے لئے رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے اور نہ میں سمجھانا چاہتی ہوں۔

جاوید :۔ خیر تو آپ جانیں۔

فروزاں :۔ تم تاریخ طے کر لو اور جلدی ہی کر لو۔

جاوید وہاں سے اٹھ کر سیدھا زاہدہ کے پاس پہنچا اور ساری گفتگو سنائی۔

زاہدہ بھی عجیب مشکل میں تھی وہ سوچتی کہ اگر امی کو شادی کرنے

سے منع کر دوں تو شاید جاوید کو برا معلوم ہو کہ خواہ مخواہ میرا خرچ بڑھانے میں مدد کر رہی ہے اور اگر اس شادی کی مخالفت نہ کروں تو خدا جانے کل کو امی پر کیا کیا مشکلیں پڑیں، بہر حال ان سب وسوسوں کے باوجود شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور چوتھے روز شادی ہو گئی، قاسم حسین خوش تھا کہ اس نے بچپن کی بات کا بدلہ لے لیا،

شب وصل ہی فرزانہ پر جو گذری اس سے آئندہ کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نکاح کے بعد جب فرزانہ قاسم کے گھر پہنچی تو وہاں صرف نوری موجود تھی۔ نوری نے فرزانہ کو ایک کمرے میں بٹھا دیا اور خود اجازت لے کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد قاسم شراب کے نشہ میں چور او رہا تھ میں شراب کی بوتل اور گلاس لئے کمرے کے اندر داخل ہوا فرزانہ جھکی ہوئی بیٹھی تھی،

قاسم کڑک کر بولا،

" الو کی پٹھی ایسی دلہن بنی بیٹھی ہے۔ جیسے تیرہ برس کی کنواری ہو، کھڑی ہو اور ہمیں شراب پلا، ان سوکھے ہوئے ہاتھوں سے جن کا رس ریاض الدین پی کر قبر میں سو گیا، ہم سے یہ خشک آنکھیں ملا جن کی شوخی اور مستی ریاض نے ختم کر دی ہے اٹھ کھڑی ہو "

فرزانہ کا دل دھڑکنے لگا، وہ اٹھی، شوہر کو سلام کیا۔ اور بوتل ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی،

"آپ اتنی شراب نہ پیا کریں"
یہ کہنا تھا کہ قاسم بگڑ گیا اور بولا۔
"حرامزادی ہمیں نصیحت کرتی ہے۔ تو مولوی ہے یا مولنیا۔ آخر کیا ہے۔ تو ہماری غلام ہے، یا ہم تیرے۔ یاد رکھ اگر گز بھر کی زبان یہاں چلائی تو کاٹ کر چھ ٹکڑے کر دوں گا۔ آج ہمیں سلام کرتی ہے کل کی بات بھول گئی جب کہا کرتی تھی کہ کھانا لینے آیا کرو تو ہم کو سلام کیا کرو۔ ہوں۔ نواب زادی یہ بھول گئی کہ کل تو بھی سلام کرنے کے لئے مجبور ہو سکتی ہے"
فرزانہ کیا بول سکتی تھی۔ خاموش رہی۔
قاسم پھر بولا۔
"بڑی بی ہم سے بات کرو۔ مردے سے شادی کرنی ہوتی تو ہم قبرستان جاتے۔ کیا منہ میں زبان نہیں ہے۔"
فرزانہ نے تھوڑی بہت بات شروع کی تو وہ سر جملے پر برستا اور گرجتا رہا۔ غرض اسی قیامت میں شب وصل گذری۔
دوسرے دن صبح کو جب فرزانہ نے گھر پر ایک نظر ڈالی، تو وہاں نہ برتن تھے نہ گھر کا کوئی سامان۔ صرف ایک چارپائی تھی اور ایک لوٹا جو ٹوٹے ہوئے میلے گھڑے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ ابھی قاسم سو رہا تھا اور فرزانہ اس کے اٹھنے کی منتظر تھی، جب وہ سو کر اٹھا تو فرزانہ نے کہا۔

"آپ کھانا یہاں نہیں پکواتے"۔

قاسم بولا،

"ہوں ۔ تجھے آتے ہی روٹی کی فکر ہوئی ۔ مگر میری جان یہاں تو خانہ بدوش زندگی ہے کبھی مشتری بائی کے کمرے پہ کھانا کھا لیا اور کبھی زہرہ بائی کے کمرے پر ۔ یہ گھر تو صرف اس لئے ہے کہ تجھ جیسی آئیں اور پھڑ پھڑا کر دم توڑ دیں ۔ اس گھر میں تین لڑکیاں تجھ سے پہلے دم توڑ چکی ہیں اور اب چوتھی تو ہے مگر تیرا کیا ہے ۔ آخری عمر ہے ۔ زیادہ تکلیف اٹھانی نہ پڑے گی ، اور جلدی ہی خلاصی ہو جائیگی"

فرزانہ شوہر کے منہ دھونے کے لئے پانی لینے بڑھی تو گھڑا خالی تھا وہ پھر بولی ۔

"یہاں تو پانی بھی نہیں ہے ۔ آپ منہ کیسے دھوئیگے"۔.....

اری پگلی شیروں کے منہ ہی کب دھلتے ہیں اور اگر تجھے پانی کی ضرورت ہو تو سڑک کے نلکے سے پانی بھر لایا کر ۔ اور کھانے کے لئے "اپن" کے پاس تو کچھ ہے نہیں اب تیری مرضی ہے چاہے یہاں رہ چاہے واپس چلی جا ۔ ہاں کبھی کبھی آنے کی اجازت ہے"۔

فرزانہ کے آنسو پھوٹ پڑے اور قاسم کے پیروں پر گرتے ہوئے کہنے لگی ۔

"آخر مجھے کس جرم کی سزا دینا چاہتے ہو میں نے تو شادی اس لئے کی تھی کہ میں سمجھتی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہے مگر ....."

مگر کیا ۔ میں نے کب تجھ سے آنکھ مٹکا کیا تھا ۔ کس دن محبت کا خط لکھا تھا ۔ خواہ مخواہ چڑیل سر ہوئے جاتی ہے ۔ میں نے تو شادی صرف اس بات کا بدلہ لینے کے لئے کی تھی جب میں نے تیرے حسن کی تعریف کی تھی اور تو نے مجھے نوکری سے علیحدہ کردا دیا تھا تو یہ سمجھتی تھی کہ مجھے روٹی ہی نہ ملے گی ۔ میں بھوکا مرجاوں گا ۔ مگر تیرا یہ خیال غلط نکلا آج تو میرے رحم وکرم پر ہے مگر یاد رکھ کہ میں نے رحم و کرم کا لفظ ہی سنا ہے اس کے معنی پر کبھی غور نہیں کیا ۔ اب آخری فیصلہ یہ ہے کہ تجھے ایک ہفتہ تک صبح کی چائے اور دونوں وقت کا کھانا ہوٹل سے آجایا کرے گا ۔ اور ایک ہفتہ بعد تیری چھٹی ہے ، چاہے داماد کے گھر رہنا چاہے یہاں رہنا ۔ مگر یہاں کھانے دانے کا کوئی انتظام نہ ہوگا یہ بھی تیرے ساتھ رعایت ہے ورنہ اس گھر سے کوئی زندہ نہیں گیا سب کے جنازے نکلے ہیں

فرزانہ کے آنسو قابو میں نہ تھے ۔ وہ صرف رو رہی تھی ۔ کچھ کہنا نہ چاہتی تھی ۔ کیوں کہ قاسم کا طرز عمل ایسا تھا جس سے یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ کوئی بات اس پر اثر نہ کریگی ۔

قاسم نے چلتے ہوئے کہا ۔

" اگر رات کو میرے آنے پر بھی تو روتی ہوئی ملی تو تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا ۔ میں جس وقت آؤں تجھے ہنستا ہوا پاؤں "۔

قاسم کے جانے کے بعد زاہدہ اور فیاض آئے تو دیکھا کہ امی کی

آنکھیں رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی ہیں ۔

جاوید نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ ضرور معاملات خراب ہیں مگر شرم و مصلحت کے تحت کچھ پوچھ نہ سکا ۔

فرزانہ نے بھی جب بچوں کو دیکھا تو اس کا کلیجہ پھٹنے لگا ۔ مگر بڑی مشکل سے آنسو پئے ۔ دو تین گھنٹے بعد یہ لوگ چلے گئے اور فرزانہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

وہ روتی رہی اور اس کے اشکوں کا سیلاب نہ رک سکا ۔ رات کو قاسم آیا تو فرزانہ کو بہ مجبوری تبسم سے استقبال کرنا پڑا ۔ وہ آج بھی اسی طرح مدہوش تھا ۔ اور سفاکانہ طرز عمل کار فرما رہا ۔ ابھی پانچ ہی روز گذرے تھے کہ قاسم نے الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا ۔

" پرسوں یہاں ایک اور کبوتری آنے والی ہے لہذا تم اپنا بوریا بستر کل تک ضرور گول کر دو "

فرزانہ پانچویں دن اپنے گھر واپس آگئی ۔ فرزانہ نے قاسم کی بے توجہی کا تذکرہ کسی نہ کسی طرح جاوید سے کر ہی دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر طلاق مل جائے تو میں ایک عذاب سے بچ جاؤں ۔

جاوید کو یہ سنکر بہت تکلیف ہوئی اور وہ قاسم کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ طلاق دیدے ۔

قاسم نے جواب دیا ۔

" برخوردار کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو ۔ طلاق دینا کوئی شریفوں

کا کام تھوڑا ہی ہے۔ یہاں تو آج تک کسی کو طلاق نہیں دی گئی اور نہ آئندہ دینے کا ارادہ ہی ہے۔ یہ بھی کیا کم ہے کہ میں نے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ ورنہ میں چاہتا تو کمرے میں ہی مقید رکھتا نہ کسی سے ملنے دیتا اور نہ اس کی آواز کوئی سن سکتا"۔

جاوید نے جب دیکھا کہ یہ طلاق دینا نہیں چاہتا اور محض پریشان کرنا چاہتا ہے تو اس نے عدالتی کارروائی کی دھمکی دی۔

قاسم یہ سنکر ہنسا اور کہنے لگا۔

"بھیا جاوید جب تم عدالت اور کچہری کے لئے تیار ہو تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک ہزار روپیہ مجھے دو اور طلاق حاصل کر لو"۔

جاوید اب اس کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ وہ خاموشی سے گھر چلا آیا۔ اس نے زاہدہ کو ساری باتوں سے آگاہ کیا۔

زاہدہ بیچاری رونے لگی اور کہنے لگی۔

"کچھ بھی ہو آپ امی جان کو اس مصیبت سے نجات دلا دیں میں آپ کی منت کرتی ہوں"۔

جاوید نے فرزانہ سے کچھ نہ کہا اور چپکے سے ایک ہزار روپیہ کا انتظام کر کے قاسم کے پاس پہنچا۔

قاسم کو وہ کچہری لے گیا۔ سرکاری کاغذ پر طلاق لکھائی اور ایک ہزار روپیہ اس کے حوالے کیا۔ گھر پہنچ کر اس نے طلاق نامہ فرزانہ کے سامنے رکھدیا۔ اور فرزانہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کی ہچکی بندھ

گئی۔ جاوید کی تسلیوں سے وہ کچھ ہوش میں آئی اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

اب فرزانہ نے اپنے دل سے شادی کا ارادہ تو تقریباً ترک کر دیا مگر وہ اس فکر میں ضرور رہی کہ کوئی ایسا کام شروع کرے جس سے اس کے گذارے کا انتظام ہو جائے۔

فرزانہ کے پاس کوئی معقول رقم بھی نہ تھی۔ جس سے وہ کوئی کام شروع کرسکتی اور...... اگر وہ جاوید سے رقم لیتی تو کس منہ سے ؟ داماد کا احسان پہلے ہی کیا کم تھا۔

بہرحال یہ ضرور ہو تھا کہ جاوید اس قابل ہوگیا تھا کہ وہ فرزانہ کو ہر قسم کی مدد دے سکے۔ مگر جاوید کہتا تھا کہ نہ کسی کام کے کرنے کی ضرورت ہے اور نہ پریشانی کی۔ بلکہ تمام گھر کی ذمہ داری میرے اوپر ہے جسے میں خوشی سے برداشت کروں گا۔

زاہدہ نے بھی اپنی ماں کو سمجھایا کہ وہ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں اور جاوید کے احسان کا احسان نہ سمجھیں۔ فرزانہ خاموش ہوگئی۔

ادھر جاوید کے والد اور والدہ ہر وقت پریشان رہتے تھے۔ ان کے گھر کا چراغ دوسری بزم کی زینت بن چکا تھا۔ کچھ تو خان صاحب کی سختی۔ اور کچھ ان کی بیگم کی بدمزاجی نے جاوید کو گھر سے بدظن کر دیا تھا۔ ورنہ اگر عقل سے کام لیا جاتا تو جاوید ان کے ہاتھوں سے نہ

جاتا۔ بہر حال یہ غم جاوید کی ماں کو گھن کی طرح لگا اور وہ مسلسل بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

جاوید کو دکان پر خبر ملی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ بیتاب ہو کر اپنے گھر بھاگا تو دیکھا کہ خاں صاحب لاش کے پاس بیٹھے بے تحاشہ رو رہے ہیں۔ اور اس کی والدہ دنیا کے تمام جھگڑوں سے دست بردار ہو کر بے حس و حرکت پڑی تھی۔

جاوید کی ہچکی بندھ گئی اور وہ خانصاحب سے لپٹ کر روتے لگا۔ بار بار اپنی ماں کا منہ کھول کر دیکھتا۔ اور دھاڑیں مار کر روتا۔ مگر اس کی ماں اب ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ جب سب رو دھو چکے اور دلوں کا غبار آنسوؤں میں بہہ گیا۔ تو نہلا دھلا کر اس کو دفنانے چلے ......

زاہدہ اور فرزانہ بھی آ گئی تھیں اور گھر کے کام میں نمایاں دلچسپی لے رہی تھیں۔ دفنا کر لوٹ کر آئے تو خانصاحب نے کہا،

"جاوید اب تیرے سوا اس بدنصیب کا کوئی مونس نہیں ہے زاہدہ میری بہو ہے۔ یہ گھر اس کا ہے۔ اور یہ اب یہیں رہے گی۔ فرزانہ اور فیاض بھی یہیں رہیں گے۔ اُس مکان کو خالی کر دو اور سامان کو یہیں لے آؤ۔ دو تین روز بعد سب لوگ خاں صاحب کے پاس آ گئے۔ اور گھر کی چہل پہل میں خان صاحب بہت جلد اپنا غم بھول گئے۔

گھر کا تقریباً تمام کھانے پکانے کا کام فرزانہ کرتی تھی۔ فرزانہ بہت

خوش تھی کہ جاوید اپنے گھر آگیا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر جو افسردگی قاسم حسین نے چھوڑی تھی۔ وہ اب نیم مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔

خان صاحب کے دل میں فرزانہ روز بروز گھر کرتی جارہی تھی۔ اور دونوں کو تخلیہ میں بات چیت کرنے کے مواقع بھی مل رہے تھے۔ خان صاحب کے بعض اوقات مذاقیہ جملے فرزانہ کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے۔ مگر وہ مصلحتاً ان باتوں پر غور نہ کرتی۔ مگر ایک دن خانصاحب نے فرزانہ سے کہہ ہی دیا۔

" کب تک زندگی کے دن یوں گزار دگی فرزانہ۔ ایک گھر میں سب ایک ہو جائیں تو اچھا ہے۔

فرزانہ کو یقین سا نہ آیا۔ خان صاحب نے کئی مرتبہ اپنی بات کا جواب پایا اور فرزانہ بھی خان صاحب سے بے تکلف ہو گئی۔ مگر اب دقت یہ تھی کہ وہ آپس میں ایک کس طرح ہوں۔ نہ تو فرزانہ اپنی بیٹی سے یہ بات کہہ سکتی تھی اور نہ خان صاحب جاوید سے اظہار کر سکتے تھے۔

دونوں پریشان تھے۔ کہ کیا کریں اور بے چین بھی کہ کسی طرح ایک ہو جائیں آخر خان صاحب نے اپنے ایک پرانے دوست ہاشم کو اس ڈرامہ کا ہیرو بنایا۔ اور ہاشم نے جاوید سے بات چیت شروع کی اور کہا۔

" بھئی میں تو تمہارے والد کو مجبور کر رہا ہوں کہ تمہاری ساس سے

نکاح کر لیں۔ ان کا بھی گھر آباد ہو جائے گا۔"

جاوید نے جواب دیا۔

"ہاشم چچا بھلا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر ابا جی تیار بھی ہو جائیں تو کیا ضروری ہے کہ ہماری ساس بھی رضا مند ہو جائیں۔ کیوں کہ انھیں پچھلی مرتبہ ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ وہ شاید ہی نکاح کی جرات کر سکیں۔"

ہاشم پھر کہنے لگا۔

"میاں برخوردار کہاں کی مثال کہاں دیتے ہو۔ کیا تمہیں اپنے ابا سے امید ہے کہ وہ قاسم حسین کی سی حرکت کریں گے"؟

جاوید کو اس دلیل پر خاموش ہو جانا پڑا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ معاملہ کس طرح طے پائے۔ ہاشم نے اپنی بیوی کے ذریعہ سب معاملات طے کر دیئے اور فرزانہ کا جاوید کے ابا سے نکاح ہو گیا۔

دونوں بہت خوش نظر آتے تھے۔ جاوید اور زاہدہ بھی جس قدر خوش ہوتے کم تھا سارا گھر ایک ہو چکا تھا اب فرزانہ کو نہ فیاض کی فکر تھی اور نہ داماد کے احسانات کا خیال تھا زندگی بڑے مزے سے گذر رہی تھی مگر ابھی پورا سال بھی نہ گذرا تھا کہ شہر میں ہیضہ کی وبا پھیلی اور خانصاحب اس کا شکار ہو گئے۔ خانصاحب کے انتقال سے سارے گھر کو صدمہ ہوا مگر ایک چیز فساد کی وجہ بھی بن گئی تھی اور وہ چیز خانصاحب کی دولت تھی، دولت کی تقسیم کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ فرزانہ کا خیال تھا کہ خانصاحب کی دولت کے چار حصے کئے جائیں تین حصوں میں وہ خود، فیاض اور زاہدہ حقدار ہوں۔ اور چوتھا حصہ جاوید کا ہو۔

مگر جاوید یہ کہتا تھا کہ ایک فرزانہ کو دیا جائے اور تین حصے اسے دیئے جائیں یہ مسئلہ اس قدر ٹیڑھا ہوتا گیا۔ ادھر ادھر کے مردوں اور عورتوں نے فرزانہ اور جاوید کو بھڑکانا شروع کیا۔ عورتیں فرزانہ سے کہتیں کہ اگر تم حصوں میں رعایت سے کام لوگی تو کل کو پھر داماد کی کمائی پر زندگی گزارنی پڑے گی اور ہو سکتا ہے کہ داماد کی نظر میں یہ سوچ کر بدل جائیں کہ اس نے اپنا حصہ تو ختم کر دیا ہے اور اب پرائے پیسہ پر دانت لگائے بیٹھی ہے ادھر جاوید کے دوست یہ کہتے کہ سمجھا وہ تین شادیاں کر چکی ہے اگر تم نے اپنا سمجھ کر تین حصے دیدیئے تو کل کو وہ کسی اور سے نکاح کرلیگی اور تم الو کے الو رہ جاؤ گے۔

ان معاملات نے اس قدر پیچیدگی اختیار کی کہ جاوید اور فرزانہ کی اچھی خاصی چل پڑی زاہدہ بیچاری بالکل خاموش تھی کیوں کہ دونوں اس کے لئے برابر تھے۔ خدا کی شان ہے کہ کل تو جاوید نے اپنے باپ کا روپیہ چرا کر فرزانہ کے سپرد کیا۔ ایک ہزار روپیہ دیکر قاسم حسین سے رہائی دلوا دی مگر آج وہ ایک ایک پیسے کی تقسیم میں اس قدر سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کل تک فرزانہ بھی سب کچھ داماد پر نثار کرنے کو تیار تھی مگر آج وہ بھی اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے پوری طرح کمربستہ تھی جب معاملہ کسی طرح نہ سلجھا اور پیچیدگی اور بھی بڑھ گئی تو مجبوراً محلے والوں نے فیصلہ کرا دیا اور دونوں کو آدھے آدھے کا حصہ دار مقرر کرکے روپے کی تقسیم کر دی گئی۔

روپے کی تقسیم کے بعد فوراً فرزانہ اپنے مکان میں واپس چلی گئی اور جاوید اور زاہدہ اکیلے رہ گئے۔ زاہدہ کو بہت رنج ہوا کہ اچھے خاصے تعلقات

روپیہ کی وجہ سے خراب ہو گئے۔

اب جاوید فرزانہ کے پاس کبھی نہ جاتا اور نہ فرزانہ آتی۔ بلکہ زاہدہ ہی ماں سے مل آیا کرتی تھی۔ فرزانہ نے اس روپیہ سے سائیکل رکشائیں خریدلیں ایک منشی نوکر رکھ لیا اور کام چلنے لگا۔ اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی بے فکری اور خوش حالی نے فرزانہ کے دل میں پھر گدگدیاں شروع کر دیں۔ وہ اب شادی کے لئے تیار تو نہ تھی۔ مگر ان گدگدیوں کے ازالہ کی بھی فکر میں تھی۔

فرزانہ کا منشی ایک نو عمر لڑکا تھا جس نے آٹھویں جماعت سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ فرزانہ نے اپنے منشی منیر پر زیادہ شفقت شروع کر دی اور اس شفقت کا نتیجہ انتہائی محبت ہی نکلا۔ فرزانہ منیر کے بغیر ایک منٹ نہ گذار سکتی تھی۔ اب منیر صرف منشی نہ تھا بلکہ مالک بھی جتنی آمدنی چاہتا خرچ کرتا۔

منیر کی شراب کی بھی عادت تھی اور اب تو پینے کے اچھے مواقع فراہم ہو گئے تھے۔ منیر مستقل طور سے فرزانہ کے گھر رہنے لگا رات کو بوتل لاکر خود پیتا اور فرزانہ کو پلاتا۔ پہلے پہل جب فرزانہ نے منع کیا تو اس نے چلے جانے کی دھمکی دی جسے فرزانہ برداشت نہ کر سکتی تھی اور جب اس نے پہلے دن شراب پی تو ایسا محسوس کیا جیسے اس کی نو عمری واپس لوٹ آئی ہے پھر تو وہ ہر روز پینے لگی۔

منیر کی جرأت بڑھ چکی تھی اور وہ زاہدہ کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اور اکثر چھیڑنے کی بھی جرأت کی تھی مگر زاہدہ اسے طرح دیتی رہی۔ ابھی جاوید کو فرزانہ کی ان حرکتوں کا علم نہ تھا اگر علم ہو جاتا

تو وہ کبھی زاہدہ کو ماں سے ملنے کی اجازت نہ دیتا۔

ایک دن دوپہر کو فرزانہ منیر کو گھر چھوڑ گئی اور خود اپنی ایک رکشا کے سلسلے میں کچہری چلی گئی اتفاق سے زاہدہ آگئی۔ منیر اکیلا تھا کیوں کہ فیاض بھی اسکول گیا ہوا تھا منیر پر شیطان سوار تھا اور اس نے بغیر سوچے سمجھے دست درازی شروع کر دی اور بہت دیر تک پریشان کرتا رہا آخر فیاض نے دستک دی تو زاہدہ کی جان میں جان آئی اور منیر کو بمجبوری دروازہ کھولنا پڑا۔

زاہدہ سوچ رہی تھی کہ منیر کس قدر بدمعاش اور پاجی ہے نہ جانے اسے امی نے کیوں گھر میں رکھا ہے وہ عجیب الجھن میں تھی کہ شکایت کرے یا نہ کرے اور کرے بھی تو کس سے کرے اگر وہ اپنے شوہر سے شکایت کرتی ہے تو جھگڑا اور طول پکڑے گا اور زاہدہ کا آنا جانا بند ہو جائے گا اور اگر وہ امی سے شکایت کرے تو انہیں یقین نہیں آئے گا اور منیر کی ہمتیں بڑھ جائیں گی بہرحال اس نے خاموشی بہتر سمجھی مگر یہ بھی عہد کر لیا کہ اگر فرزانہ کسی دن گھر نہ ہو تو وہ واپس آجائے گی۔

فرزانہ کی یہ عیاشی کب تک پردہ راز میں رہتی ہوتے ہوتے لوگوں کو خبر ہونے لگی اور محلے والوں نے مل کر فرزانہ سے محلہ خالی کرانے کا ارادہ کر لیا اور ایک دن مجبوراً فرزانہ کو گھر خالی کر کے شہر سے باہر ایک مکان میں پناہ لینی پڑی۔ منیر بدستور ساتھ تھا۔ فیاض تعلیم کی وجہ سے اپنی بہن زاہدہ کے پاس چلا گیا اور فرزانہ اکیلی منیر کے ساتھ تنہا مکان میں رہنے لگی۔

یہ خبر جاوید کو ملی اور اسے بہت رنج ہوا ۔ اس نے زاہدہ سے کہا کہ تم اب اپنی اماں سے ملنے اور وہاں جانے میں احتیاط برتنا ۔ میں تمہیں ان سے ملنے کو بند نہیں کر سکتا ۔ بلکہ صرف تمہاری وجہ سے کہتا ہوں کہ تم بھی بدنام ہو جاؤ گی ۔ زاہدہ نے بھی احتیاط برتنے کا وعدہ کیا اور بات آئی گئی ہو گئی ۔

چند ماہ بعد فرزانہ کی تمام پونجی ختم ہو گئی شراب نے اسے مدقوق کر دیا تھا ۔ اسے حرارت رہنے لگی تھی ۔ مگر منیر کی محبت اسی طرح دل میں موجود تھی اب منیر نے فرزانہ سے صاف صاف کہدیا ۔

"جب پیسہ نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلیگا ۔ میں تو اب جاتا ہوں کہیں کام ڈھونڈوں گا ۔"

مگر فرزانہ اسے چھوڑنے کے لئے بالکل تیار نہ تھی اس لئے مجبور ہو کر وہ پیشہ کرانے پر رضامند ہو گئی ۔ اب فرزانہ باقاعدہ عصمت فروشی پر اتر آئی تھی ۔

منیر گاہک لاتا اور اسی طرح خرچہ چلتا اب زاہدہ کو بالکل ہی ماں سے ملنے کی ممانعت تھی ۔ کیونکہ فرزانہ کی عصمت فروشی کے چرچے سارے شہر کے بچوں اور بڑوں کی زبان پر تھے ۔ فرزانہ کی صحت گرتی گئی اور آخر وہ لاچار ہو گئی ۔ اور چارپائی سے لگ گئی ۔

منیر نے اسے ہسپتال میں داخل کرا کر سبکدوشی حاصل کر لی اور چار پانچ روز بعد کسی کے ذریعہ جاوید کو اطلاع کرا دی ۔ کہ فرزانہ موت وحیات کی کشمکش میں پڑی ہے اور فلاں ہسپتال میں ہے ۔

جاوید کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے وہ سوچ رہا تھا کہ فرشتہ صفت فرزانہ

لے دنیا کی کس قدر ٹھوکریں کھائیں اور کس منزل تک پہنچ گئی اس لیے فوراً دکان بند کی اور گھر آیا فیاض اور زاہدہ کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچا۔ لبتر سے کا نمبر معلوم کیا اور وہاں پہنچے تو دیکھا کہ فرزانہ ایک پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ بخار شدید تھا اور اس کے ہونٹ متحرک رہے تھے۔

زاہدہ اور فیاض اپنی امی سے لپٹ گئے اور چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ تمام ہسپتال چیخوں سے گونج اٹھا مگر فرزانہ کو اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ وہ اپنے جگر پاروں کو اپنے کلیجے سے لگا کر تسلی دے سکتی۔ جاوید کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

جاوید کی نظر میں اس وقت فرزانہ کا کوئی گناہ نہ تھا بلکہ ہمدردی کا جذبہ جوش مار رہا تھا۔ جاوید نے ہسپتال والوں سے اجازت لی اور فرزانہ کو اپنے گھر لے آیا۔

فرزانہ کو گھر لا کر جاوید نے تیمارداری اور علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ مریضہ ٹی بی کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے۔ علاج کی بجائے دعاؤں کی ضرورت ہے زاہدہ اور فیاض اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ماں کو ہوش آجائے تو دو چار باتیں کر لیں مگر حالت دن بدن بگڑتی ہی گئی۔ آخر چوتھے روز فرزانہ نے ذرا آنکھیں کھولیں۔ سارا گھر اس پر جھک گیا۔ مگر فرزانہ نے کسی کی طرف بھی محبت سے نہ دیکھا۔ بلکہ انتہائی نحیف آواز میں پوچھا

"منیر کہاں ہے۔ اسے بلا دو۔"

جاوید نے فرزانہ کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے منیر کی تلاش کی اور اسے گھر لے آیا۔ فرزانہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ جاوید نے شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"خالہ منیر آگیا"۔

فرزانہ نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے کمزور ہاتھ اس کی طرف بڑھا دئے مگر وہ منیر کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر گلے نہ لگا سکی اس کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

منیر لاکھ سنگدل تھا مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے نظر اٹھائی تو قریب ہی زاہدہ آبدیدہ کھڑی تھی ان دونوں کی نگاہیں ملیں اور جھک گئیں سارا گھر چیخوں سے گونج اٹھا آج تو منیر بھی اظہارِ رنج و غم میں سارے گھر کا اسی طرح ساتھ دے رہا تھا جیسے وہ بھی گھر کا فرد ہو اگر دیکھا جائے تو وہ بھی یقیناً گھر ہی کا فرد تھا مگر سماج، قانون اور مذہب اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بہرحال جب ذرا رو دھو کر طبیعت کو کچھ سکون ہوا تو جاوید نے منیر کو روپے دیئے اور کفن وغیرہ کا انتظام کرنے کیلئے کہا مگر۔ منیر نے کہا۔

"جاوید بھائی مرحوم کی کچھ رقم میرے اوپر واجب ہے میں تمام انتظام اسی روپے سے کر دوں گا۔ جب ان کا روپیہ موجود ہے تو پھر تمہارے روپے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کچھ تھوڑی سی تکلفاً بحث کے بعد جاوید راضی ہو گیا اور منیر کفن وغیرہ لینے چلا گیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت منیر نے جو اس غیر متوقع شرافت کا ثبوت

دیا اس کی بنیاد کس نئی اسکیم پر تھی بہرحال یہ ضرور ہے کہ منیر کی اس نئی ہٹ کلس سے نہ صرف زاہدہ بلکہ جاوید بھی بہت زیادہ متاثر ہوا اور کچھ دیر کے لیے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ منیر کے متعلق محض لوگوں کا پروپیگنڈا ہے وہ بہت شریف لڑکا ہے اور زاہدہ نے بھی اس بات پر منیر کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیا جو ایک مرتبہ فرزانہ کی غیر موجودگی میں واقع ہو چکی تھی ۔

فرزانہ کو دفنا دیا گیا آخری دعا کے لیے ہاتھ اٹھے اور پھر سب نے اظہار ہمدردی کیا اور چلے گئے مگر منیر باہر ڈیوڑھی پر بیٹھا روتا رہا جاوید نے کئی مرتبہ کہا کہ منیر اندر آ جاؤ مگر اس نے کہا نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں منیر نے سوئم سے لیکر چہلم تک بڑی باقاعدگی سے شرکت کی تھی چہلم کے دن جب فقراء و مساکین کھانا کھا کر چلے گئے اور گھر میں صرف زاہدہ، جاوید، فیاض اور منیر رہ گئے تو جاوید نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا ۔ اور کہا ۔

بھئی منیر تمہارے جو طور طریقے اب تک ہمارے سامنے رہے ہیں ان سے تمہاری شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا مگر لوگوں کا کہنا کہاں تک صحیح ہے" ؟

منیر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔

" جاوید بات یہ ہے کہ یہ دنیا ذرا سی بات کا افسانہ بنا دیتی ہے ۔ رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہے اگر آپ یقین کر سکیں تو میں سنائے دیتا ہوں ورنہ صفائی کی ضرورت اس لیے نہ سمجھتا تھا کہ اس سے نہ تو کوئی فائدہ ہوگا اور نہ ہی دنیا کا خیال بدل سکے گا ۔ بہرحال مجھے مرحومہ نے ترس کھا کر اپنے یہاں نوکری پر رکھ لیا میں نے پہلے بھی رکشاؤں کے کام میں دلچسپی لی تھی اس لیے جب میرے تحت

رکشائیں چلیں تو آمدنی زیادہ ہو گئی۔ اس آمدنی کے اضافے اور میری محنت و دیانتداری کی وجہ سے مرحومہ کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی اور انھوں نے اسی لئے مجھے کھانا بھی کھلانا شروع کر دیا میری محنت میں جب انھوں نے اور ترقی دیکھی اور میرے افعال کو غیر شریفانہ نہ سمجھا تو گھری میں سونے کی اجازت دیدی میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں میں نے دو لغزشیں کی ہیں کہ توبہ کرتے کلیجہ کانپتا ہے مگر مرحومہ کو میں نے ہمیشہ مالک کی نظر سے دیکھا میں نے تیسرے فاقہ کے بعد مرحومہ کی ملازمت کی تھی ایسی صورت میں مجھے سنبھل سنبھل کر چلنا تھا۔ ممکن تھا کہ اگر مالکہ نوعمر ہوتی تو میرا ارادہ شیطانی ہو جاتا۔ مگر مرحومہ سے میری نفسانی وابستگی کس قدر مضحکہ خیز ہے میں ان کی اولاد کے برابر ہو کر کس منہ سے محبت کا اظہار کر سکتا تھا یا مرحومہ کو بھی یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی۔ مرحومہ نے مجھے ہمیشہ اولاد کے برابر سمجھا مگر لوگوں نے غلط بیانی سے کام لیا اور ہمیں بدنام کرنا شروع کر دیا۔

یہ بات جب مرحومہ کے نوٹس میں آئی تو میں نے کہا۔

"کہ لوگ بہت بدنام کر رہے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں کہیں اور ملازمت کر لوں"۔

میری اس بات پر مرحومہ کو بہت غصہ آیا اور کہنے لگیں۔

"جب تک پاکیزگی ہمارے درمیان قائم ہے کوئی وجہ نہیں کہ تم یہاں سے نوکری چھوڑ کر جاؤ"۔

میں خاموش ہو گیا اور کام کرتا رہا اسی دوران میں ان کو سخت نزلہ ہوا اور کچھ سردی کا اثر ہو گیا ڈاکٹر نے بتایا کہ برانڈی پیو میں برانڈی کی بوتل لے آیا۔

انہوں نے وہ استعمال کی اور دو تین روز کے بعد کچھ زیادہ مقدار میں استعمال کی جس کی وجہ سے سرور ہو جاتا تھا اس سرور میں انہوں نے کچھ لطف محسوس کیا اور صحت اچھی محسوس کی لہذا اس بوتل کے لیے دوسری منگالی اور اسی طرح روز بروز ان کے پینے کی عادت بڑھ گئی میں نے جب یہ دیکھا کہ مالکہ شراب پینے لگیں تو میں نے بھی وقتاً فوقتاً پینی شروع کر دی محلے والوں میں چہ میگوئیاں بڑھنے لگیں مجبوراً ہمیں محلہ چھوڑ دینا پڑا۔ مرحومہ نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی تھی جس کی وجہ سے میں ان کا ساتھ نہ چھوڑ سکا انہوں نے کہا تھا "منیر میں نے تمہیں فاقہ کی موت سے بچایا تھا اب تمہارا فرض ہے کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ"۔ اور اسی لئے میں نے ان کے ساتھ رہنے کی قسم کھالی جہاں تک شہر میں اس بات کا چرچا تھا کہ مرحومہ نے پیشہ وری اختیار کر لی ہے اس کی اصلیت محض اتنی تھی کہ نشہ کی حالت میں مرحومہ کو غزلیں وغیرہ سننے کا شوق ہو گیا جن کی وجہ سے شاعروں کی اور ان کے ساتھیوں کی آمد شروع ہو گئی اور اسی آمد و جامد نے انہیں بدنام کر دیا انکی حالت شاید شراب سے اتنی خراب نہ ہوتی جتنی مہمانداری سے ہو گئی۔ ادھر مالی حالت خراب ہونے کا صدمہ اور ادھر اولاد اور داماد سے بے تعلقی کا رنج دونوں نے صحت کو ایکدم گرا دیا اور وہ اس منزل پر پہنچ گئیں جہاں سے کوئی نہ لوٹ سکا میں نے جب حالت زیادہ خراب دیکھی تو ہسپتال میں داخل کرا دیا اور خود حاجی احمد دین کے ہاں ملازمت کر لی تاکہ کچھ ہو تو مرحومہ کی اور خدمت کر سکوں یہ تھا تمام ماجرا اب جاوید بھیا تم خود ہی فیصلہ کر دو کہ میں کہاں تک گناہگار ہوں اور مرحومہ کہاں تک ذمہ دار ہیں جاوید اور زاہدہ بہت غور سے سن رہے تھے اور دونوں اس نتیجے پر

کی شمع کو جلائے رکھوں۔

زاھدہ:۔ مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے لیکن تمہیں افشائے راز کی اجازت نہیں ہے

منیر نے اس عرصہ میں کوئی غیر اخلاقی حرکت تو نہ کی مگر گفتگو کے دوران میں یہ ضرور جتا دیا کرتا تھا کہ اسے زاہدہ سے محبت ہے عورت ایک عجیب دل کی مالک ہوتی ہے وہ اسی دل میں جس میں کل تک نفرت و حقارت مکین تھی آج پیار اور محبت کو جگہ دے سکتی ہے عورت بڑی جلدی بہکتی ہے اور خصوصاً غیر مرد کی موجودگی میں تخلیہ کے چند منٹ بھی بڑے خطرناک ہوتے ہیں تنہائی کے چند منٹ اسے قعر مذلت میں دھکیل سکتے ہیں وہ بہت جلد بہہ جاتی ہے۔ اور سماج کے ماتھے کا ٹیکہ بن جاتی ہے حالاں کہ زاہدہ کو اپنے شوہر جاوید کی محبت پر پورا اعتماد تھا مگر پھر بھی وہ اکثر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ منیر کو مجھ سے واقعی محبت ہے اور جب عورت کسی کی محبت کو تسلیم کر لے تو وہ یقیناً اس محبت کے احترام میں اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے ادھر جاوید کو شراب کی عادت ڈال دی نہ صرف شراب بلکہ طوائفوں کے کوٹھوں کے بھی چکر ہونے لگے رات رات بھر زاہدہ بیچاری اپنے بھیا کے ساتھ جاگتی رہتی اور کہیں صبح سویرے یہ دونوں لوٹتے اور زاہدہ کو بتلاتے کہ مال لانے کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر جانا پڑا تھا۔ اور جب زاہدہ کو یہ معلوم ہوا کہ جاوید شراب پینے لگا ہے تو اسے اور بھی تشویش ہوئی منیر نے زاہدہ سے اپنی صفائی کر دی تھی کہ اس نے یہ عادت نہیں ڈالی بلکہ جو دوسرے آوارہ لوگ دوکان پر آتے ہیں انھوں نے یہ سب کچھ سکھایا ہے زاہدہ نے جاوید کو لاکھ سمجھایا مگر کون سنتا ہے روز بروز عیاشیاں بڑھتی گئیں اور زاہدہ پر سختیاں بڑھتی گئیں اس سختی کے زیر اثر وہ منیر کے متعلق اور بھی شدت سے سوچنے لگی۔ اور یہ شدت انتہائی پیار میں تبدیل ہو گئی اس نے بے حجابانہ منیر سے

کہ دیا کہ وہ اسے چاہتی ہے اور بے پناہ چاہتی ہے آج منیر کو پہلی فتح حاصل ہو چکی تھی اس پر طرہ یہ کہ جاوید کسی طوائف کے ساتھ ایک ہفتہ سے غائب تھا۔ اس نے دوکان بھی فروخت کر دی تھی۔ اب صرف زاہدہ کا زیور اور مکان رہ گیا تھا چھ ماہ کے بعد جب جاوید گھر واپس لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ زاہدہ حاملہ ہے جاوید کا ماتھا ٹھنکا اور منیر اس کی نظروں میں مجرم کی طرح گھومنے لگا۔ وہ خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا مگر انتقام کی آگ اس کے دل میں جوالا مکھی کی طرح ابل رہی تھی۔ وہ مصلحتاً خاموش رہا اس نے پہلے تو مکان فروخت کیا اور پھر کسی بہانے سے زاہدہ کو ٹریدوس میں بھیجکر اس کے تمام زیورات اور قیمتی کپڑے بھی لیجا کر فروخت کر دیئے۔ جب زاہدہ واپس آئی تو جاوید نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "زاہدہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے اطوار کو بہت مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی ہو میں نے ایک طوائف کی محبت میں دوکان بیچدی اور تم کو بھی فراموش کر دیا اور چھ ماہ تک غائب رہا حالاں کہ منیر کی موجودگی نے میری غیر حاضری کو محسوس نہ ہونے دیا ہوگا پھر بھی میں نے جان بوجھکر اپنے فرض میں کوتاہی کی اور تم کو پریشان کیا بہر حال اب مجھے ہوش آگیا ہے اب نہ میں شراب پیتا ہوں اور نہ طوائفوں کے حسن سے دلچسپی ہے یہ سب نہ جانے مجھ سے کیسے ہو گیا خیر مجھے امید ہے کہ تم اس کا خیال نہ کرو گی اور ہاں میں نے آج تمہارا زیور اور کپڑے اور یہ مکان بھی فروخت کر دیا ہے"۔

زاہدہ نے چونک کر جاوید کو حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔

"تم گھبرا گئیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تمہاری ہر چیز پر میرا حق ہے اور اسی لئے

میں نے تم سے بغیر پوچھے ہی یہ سب چیزیں فروخت کر دیں مگر یہ پیسہ صرف تجارت میں لگے گا کیوں کہ تمام پونجی ختم ہو چکی ہے بھلا آئندہ زندگی کیسے گذرے گی۔ جب تک کوئی مستقل کام شروع نہ ہوگا۔"

زاہدہ یہ سن کر زیادہ پریشان نہ ہوئی اس نے سمجھا کہ اس کا شوہر راہ راست پر آگیا ہے اور یہ پونجی تجارت میں لگائیگا مگر اسے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ انتقام پر اتر آیا ہے اس لغزش کا انتقام جو زاہدہ سے سرزد ہو چکی تھی حالانکہ یہ تمام ذمہ داری جاوید پر عاید ہوتی ہے نہ وہ منیر کو آستین میں پالتا اور نہ ناگ اسے ڈستا۔ یہ تو خود جاوید کی غلطیاں تھیں اور اگر جاوید میں ذرا بھی حقیقت شناسی اور فراخدلی ہوتی تو وہ اپنے آپ ملامت کر کے زاہدہ کو معاف کر دیتا۔ کیوں کہ زاہدہ کا گناہ محض اس کے شوہر کی اچانک آوارگی اور منیر کی موجودگی کی بنا پر سرزد ہوا تھا۔ مگر ہمارے ماحول میں مرد عورت کی ذرا سی لغزش کی سزا میں اسے خودکشی پر مجبور کر دیتا ہے خود کتنے ہی گناہ کرے تو قابل معافی۔ سچائی اور انصاف کے تحت اگر دیکھا جائے تو زاہدہ کا گناہ اس کا ذاتی گناہ نہ تھا وہ تو عورت تھی بہک گئی، مگر سب سے بڑا گناہ جاوید کا تھا جو بازاری حسن کی طرف متوجہ ہو کر گھر سے چھ ماہ تک غائب رہا۔

غرضیکہ وقتی طور پر جاوید نے زاہدہ کو شیشے میں اتار لیا جب زاہدہ خاموش ہو گئی تو جاوید نے منیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"منیر میں تمہارا احسان مند ہوں تم نے بہت ہی نمک حلالی سے کام کیا ہے تمہاری خدمات میری نظر میں ایسی ہیں کیا یہ زمانہ بھی فراموش کر سکیگا۔

میں نے کاروبار کے سلسلے میں جانا ہے اس غیر حاضری کے دوران میں بھی امید ہے کہ تم زاہدہ کا ایسا ہی خیال رکھو گے جیسا کہ اب تک رکھا ہے"

جاوید کے جملوں میں بلا کا طنز تھا جسے منیر نے بری طرح محسوس کیا مگر وہ انجان سا بنا سنتا رہا اور کچھ بولنے کی ہمت نہ کر سکا۔ جاوید نے تمام گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اچھا خدا حافظ۔"

زاھدہ:۔ مگر ابھی سے۔ آپ نے تو کھانا نہیں کھایا۔ تھوڑا سا ناشتہ بنا دوں۔

جاوید:۔ نہیں ناشتہ کی ضرورت نہیں۔

زاھدہ:۔ آپکو آئے ہوئے ابھی دو روز تو ہوئے ہیں ابھی چلنے کی بھی لگ گئی ذرا دو چار روز تو ٹھہر جایئے گا۔

جاوید:۔ ارے زاہدہ یہ دو روز بھی جسقدر مجھ پر بھاری گذرے ہیں خدا ہی جانتا ہے کچھ کاروباری مصروفیت ایسی ہے کہ میرا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ورنہ جس قدر منافع کی توقع ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

ادھر منیر نے جاوید سے نظر بچا کر زاہدہ کو اشارہ کیا تو زاہدہ نے جاوید سے کہا " مگر گھر کے خرچ کے لئے کچھ روپیہ تو دیتے جایئے میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے ادھر ادھر سے قرض مانگ کر کام چلا رہی تھی "

جاوید:۔ میرے پاس اس وقت چیک ہے نقد روپے زائد نہیں ہیں میں کل ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ زاہدہ خاموش ہو گئی اور جاوید چلا گیا۔

جاوید لاہور آ گیا تھا اس کے ساتھ خورشید بائی بھی تھی یہ خوشتر ایک نوجوان

طوائف تھی مگر اپنے حربوں میں بہت ہوشیار، وہ اب تک جاوید سے آٹھ ہزار روپیہ نقد وصول کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر بھجوا چکی تھی اب یہ جاوید کی سترہ ہزار کی آخری پونجی تھی جس پر وہ دانت تیز کئے بیٹھی تھی جاوید نے اس سے کئی مرتبہ درخواست کی تھی کہ وہ شادی کر لے مگر خوشتر نے ہمیشہ یہ کہکر ٹالدیا کہ مجھکو بالکل ہی اپنا غلام نہ بناؤ اپنی محبت میں ویسے ہی اندھا کر رکھا ہے اب کیا گھر کے برتن بھی مجھ ہی سے صاف کراؤ گے اور جاوید مسکرا کر خاموش ہو جاتا چند ماہ میں خوشتر کافی رقم وصول کرنے میں کامیاب ہو گئی اور جب جاوید کے پاس کل ایک سو ساٹھ روپے رہ گئے تو اس نے پولیس اسٹیشن پر خود جاکر رپورٹ کر دی کہ

" جاوید مجھے بھگا لایا ہے میرا سارا زیور برابر کر دیا اور مجھے دھمکیاں دے کر شادی پر مجبور کر رہا ہے مگر میں واپس جانا چاہتی ہوں "۔

جاوید بغیر متوقع طور پر گرفتار کر لیا گیا اور جب وہ حوالات میں بند تھا تو اسے اتنا ہوش آچکا تھا کہ طوائفیں کسی کی نہیں ہوتیں زاہدہ کا اسے پھر بھی خیال نہ تھا اگر فکر تھی تو صرف یہ فاقوں سے نہ مر جائے انسپکٹر پولیس سے منت سماجت کے بعد یہ طے پایا کہ خوشتر کو اس کے گھر جانے دیا جائے اور جاوید کو اس وقت رہا کیا جائے جب خوشتر اپنے گھر پہنچ جائے ۔

اس تصفیہ کی رو سے تیسرے دن جاوید کو حوالات سے رہا کر دیا گیا اب وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا اور بے سہارا تھا مگر غنیمت تھا کہ میٹرک پاس تھا اس وجہ سے چند دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے سو روپے کی ملازمت مل گئی اب اس کا ارادہ یہ تھا کہ اپنی حالت کو انتہائی بہتر بنا لے اس لئے اس نے دفتری اوقات کے علاوہ

دوسرے چھوٹے چھوٹے کام بھی شروع کر دیئے اور اپنی آمدنی کو بڑھانا شروع کیا۔ زاہدہ کئی روز تک منتظر رہی کہ منی آرڈر آئے مگر کل منی آرڈر اور کیسا منی آرڈر پھر "سونے پر سہاگہ" یہ کہ چھٹے روز ہی مالک مکان کا نوٹس مل گیا کہ "یا تو پندرہ روپے ماہوار کرایہ ادا کرو ورنہ مکان خالی کر دو"

ادھر فیاض دسویں میں تھا اس کی فیس وغیرہ جاتی تھی اور سب سے بڑا مسئلہ یہ کہ وہ حاملہ تھی زاہدہ کو کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے منیر کے رویہ میں بھی تلخی آ چکی تھی اور اس نے بھی الٹی میٹم دیدیا تھا کہ روٹی نہ ملیگی تو اس گھر کو چھوڑ دوں گا زاہدہ کبھی روتی کبھی سوچتی کبھی اس کا جی چیخیں مارنے کو جی چاہتا وہ عجب عذاب میں مبتلا تھی فیاض اب کافی سمجھدار ہو گیا تھا وہ تمام باتیں سمجھتا تھا مگر کچھ کہہ نہ سکتا تھا جب اس نے اپنی بہن کی یہ حالت دیکھی تو بولا

"باجی تم فکر نہ کرو میں بڑا ہو گیا ہوں تمہیں مزدوری کر کے بھی روٹی کھلا سکتا ہوں"

زاہدہ نے فیاض کو گلے سے لگا لیا اور جی بھر کے روتی رہی منیر رو کھا سا جواب دیکر اپنے راستہ پر ہو لیا قرض ملنے کے راستے بند ہو گئے کیوں کہ ان کو پتہ چل چکا تھا کہ جاوید نے سب کچھ بیچ دیا ہے اور خورشید کو ساتھ لیکر چلا گیا ہے زاہدہ نے پہلے تو گھر کا چھوٹا موٹا سامان فروخت کر کے دن گذارے جب تمام چیزیں ختم ہو گئیں تو زاہدہ کو جاوید کی غفلت سے تلاش ہونے لگی وہ منیر کی چالاکیوں سے واقف ہو چکی تھی اور اپنے کئے پر پچھتا رہی تھی مگر کچھ اس لئے مطمئن سی تھی کہ وہ سمجھتی تھی کہ جاوید کو منیر پر شک نہیں بلکہ اس کو وہ اپنی امانت سمجھتا ہے حالانکہ خیال

زاہدہ کی سادگی اور معصومیت کی دلیل تھا۔ ورنہ جاوید تو واپسی پر فوراً ہی سمجھ چکا تھا کہ زاہدہ گناہ کی تاریکیوں میں پھنس چکی ہے۔ زاہدہ نے جاوید کی تلاش کے سلسلے میں فیاض کو اِدھر اُدھر بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ خورشید کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے اس نے سوچا کہ لاہور فیاض کو بھیجدے مگر ایک تو اس تصور سے کہ اتنے دام نہ تھے دوسرے اس خیال سے کہ کہیں وہ برا برتاؤ نہ کرے فیاض کو نہ بھیجا۔ مگر اب دن گذرنے بہت ہی مشکل نظر آنے لگے فیاض نے گھر کی یہ حالت دیکھی تو پڑھائی چھوڑ دی اور ایک ڈاکٹر کے ہاں ابتدائی کمپاؤنڈری کا کام کرنے لگا بیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی تیس روپے حالاں کہ صرف روکھی روٹی کے قابل تھے مگر فاقہ کشی کے عالم میں بہت غنیمت تھے۔ اب زاہدہ کے پورے دن تھے اور بچے کی ولادت قریب تھی، فیاض نے اپنے دوست کی خوشامد کر کے زاہدہ کو ہسپتال میں داخل کرا دیا جہاں اس کے بچہ پیدا ہوا اگر اس وقت جاوید اس کے پاس ہوتا تو وہ کس قدر خوش ہوتی مگر وہ خوش ہونے کے بجائے اس کا گلا گھونٹ کر مار دینا چاہتی تھی آج وہ اپنے بغیر ارادی گناہ پر نجید شرمندہ تھی مگر اس کی شرمندگی اور توبہ اس کے گناہ کی تاریکی کو نہ دھو سکے۔

زاہدہ کے ہسپتال کے دوران میں مالک مکان نے مکان بھی خالی کرا لیا تھا فیاض اپنا مختصر سا سامان لیئے ایک رئیس زادے دوست کے "ملازم کوارٹر" میں لے آیا تھا فیاض نے اپنے دوست اعجاز کے والد سے کہہ دیا تھا کہ جب اس کی بہن آئے گی تو وہ ان کے گھر کام کرے گی اور اس طرح انھیں جگہ دیدی گئی تھی دس روز کے بعد زاہدہ کو ہسپتال چھوڑنا پڑا اور وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں

معیشہ ہو گئی ابھی زاہدہ کو ایک ماہ آرام کی ضرورت تھی مگر اعجاز کی والدہ نے کچھ ایسی ترش باتیں کیں کہ زاہدہ کو چند ہی دن بعد ان کے گھر کا کام سنبھال لینا پڑا۔

اعجاز کے والد محکمہ نہر کے ڈپٹی کلکٹر تھے ان کے گھر مہمانوں کی آمد رہتی تھی اور ویسے بھی ماشاءاللہ گھر میں دس بارہ آدمی کھانیوالے تھے۔ اور ان سب کا کھانا بیچاری زاہدہ ہی کو پکانا پڑتا تھا ایک زچہ کو جو آرام ملنا چاہیئے تھا وہ نہ مل سکا حالات اس کے مخالف تھے گردش دوراں اس پر سایہ فگن تھی اور وہ اس انقلاب کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ننھی سی جان کو گھنٹوں بلکتے اور روتے گذر جاتے مگر دودھ پلانے کی فرصت بھی نہ ملتی تھی۔

فیاض دن بھر ڈاکٹر کے ہاں کام کرتا تھا۔ زاہدہ نے کئی مرتبہ مالکن سے کہا کہ اگر کوئی دوسرا اور ملازم ہاتھ بٹانے کیلئے رکھ لیا جائے تو اچھا ہے مگر مالکن ناک منہ چڑھا کر کہتی۔ "گیہوں کی روٹی ملنے لگی ہے نا" دو چار روٹیاں پکانا بھی مشکل ہو گیا ہے وہ وقت بھول گئی جب تیرا بھیا روتا ہوا آیا تھا اور ہمیں نے ترس کھا کر رہنے کو جگہ دیدی۔ روٹی الگ رہی۔ تنخواہ الگ اور رہنے کو مکان الگ اب اور کیا چاہیئے تجھے۔"

زاہدہ یہ سنتی تو خاموش ہو جاتی اور یہ سوچتی کہ خداوند کریم جو سزا دے رہا ہے اسے صبر سے برداشت ہی کرنا پڑے گی۔ اگر وہ دن اس کے لئے چھٹی کا ہوتا تھا جس دن تمام گھر والوں کی کسی کے ہاں دعوت ہوتی تھی زاہدہ بہت ہی سلیقہ شعار ہو گئی تھی اسے پچیس ۲۵ روپے مہینہ ڈپٹی صاحب کے یہاں سے ملتا

تھا۔ اور تیس روپے فیاض لاتا تھا وہاں پچیس روپیوں میں سے مشکل سے دس روپے خرچ کرتی اور باقی جمع کرتی روٹی کا حساب یہ ہوتا کہ جو کچھ مالکن سے لاتی اس میں دونوں بہن بھائی گذارہ کرتے غرض اسی طرح پانچ ماہ گذر گئے اب زاہدہ تقریباً تمام کام کاج کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کی صحت بھی اچھی ہو گئی تھی۔

ایک دن ڈپٹی صاحب کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے زاہدہ کو کافی سویرے اٹھنا پڑا۔ اس نے بچے کو دودھ پلا کر حسب دستور پلنگ پر لٹا کر ادھر ادھر چھوٹے تکیے لگا دیئے اور گھر میں آکر کام کرنے لگی تقریباً ۹ بجے شور مچ گیا کہ کتے نے بچے کو پھاڑ کھایا گھر میں بیگم صاحبہ نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو زاہدہ کی کوٹھڑی پر سب جمع تھے۔ انھوں نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

"ہے ہے زاہدہ ذرا دیکھیو کہیں تیرا بچہ نہ ہو"۔

زاہدہ بے تحاشہ بھاگی دیکھا تو اس کے ننھے سے بچے کی آنتیں بکھری پڑی ہیں اور تمام چہرہ کتے کے پنجوں سے دھنی ہوئی روئی بن گیا تھا ڈپٹی صاحب بیچارے بذات خود بہت ہی شریف آدمی تھے۔ انھوں نے نہ صرف زاہدہ سے معافی مانگی بلکہ دو سو روپے بھی دیئے اور کافی ندامت کا اظہار کیا مگر زاہدہ خاموش تھی وہ جانتی تھی کہ اس میں ڈپٹی صاحب کی کیا خطا اللہ کو جو منظور تھا سو ہوا۔ انھوں نے گیند تو دوسری طرف پھینکی تھی مگر اتفاق سے اس کوٹھڑی میں آپڑی۔ اور کتا کوٹھڑی میں گھس گیا گیند کی تلاش میں بچے کو مار ڈالا وہ رو دھو کر چپ ہو رہی۔ رات کو اس نے ایک خواب دیکھا۔

"ایک دربار لگا ہوا ہے ہر دو طرف آدمی صف بستہ کھڑے ہیں بیچ میں ایک تخت بچھا ہوا ہے جس پر ایک بزرگ بیٹھے ہیں وہ بزرگ حکم دیتے ہیں کہ ملزمہ زاہدہ کو لاؤ" دو سپاہی اسے پکڑ کر ان کے سامنے لیجاتے ہیں زاہدہ کے ہاتھوں میں ننھا سا بچہ ہے وہ بزرگ کہتے ہیں کہ زاہدہ تو نے پاپ کیا ہے اور کبیرہ گناہ کیا ہے تو نے اپنی پاک بازی کو چھوڑ کر گناہوں کی راہ اختیار کی ہے اپنے شوہر کو بدگمان کر دیا۔ بدگمانی کیا معنی جب اسے یقین ہو گیا کہ تیرے منیر سے تعلقات کا نتیجہ تیرا حمل ہے تو وہ غریب سے سب کچھ سہہ کر تم دونوں کو تمہارے حال پر چھوڑ کر چلا گیا اگر اسے اس ارتکاب گناہ کا علم نہ ہوتا تو وہ بھی تجھے اس طرح دھکے کھانے کو نہ چھوڑتا مگر اسے تیرے حمل سے تیری لغزش کا علم ہو چکا تھا اور وہ تجھے تیرے حال پر چھوڑ کر چلا گیا اب یہ فیصلہ ہمارے پاس ہے ہم تجھے آگاہ کرتے ہیں کہ اللہ تجھ سے ناراض ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ تیرے بچے کو جو تیرے ماتھے پر داغ ہے ہم کتوں سے پھڑوا دینے کا حکم دیتے ہیں، بزرگ کا یہ کہنا تھا کہ ایک آدمی ایک خونخوار کتا لیکر آگے بڑھا اور ادھر ایک آدمی نے زاہدہ کے ہاتھوں سے بچے کو چھین کر کتے کے سامنے ڈال دیا کتے نے ایک ہی ساعت میں چیر پھاڑ ڈالا زاہدہ نے جو چیخ ماری تو اس کی آنکھ کھل گئی، فیاض بھی اٹھ بیٹھا، اور پوچھا،

"باجی کیا بات ہے"

زاہدہ نے کچھ نہیں کہکر بات ٹال دی اور ساری رات اسی سوچ میں گزار دی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے یہ سزا محض اسی گناہ کی بدولت ملی ہے اس جرم کی پاداش میں بچے کی زندگی گئی ہے وہ ایک حد تک مطمئن بھی تھی کہ اچھا

ہوا کہ گناہ کی نشانی نہ رہی ورنہ تمام زندگی نہ جانے کیا کیا حادثے رونما ہوتے
تین چار دن بعد اس نے پھر کام شروع کر دیا اب بچہ بھی نہ تھا جس کی تشویش اسے
پریشان رکھتی۔ اب زاہدہ کی صحت اور اچھی ہونے لگی یہاں تک کہ وہ ڈپٹی صاحب کے
لڑکے اختر کی آنکھوں میں سمانے لگی۔ اختر اب زیادہ تر باورچی خانہ میں باتیں کرتا پایا
جاتا اور اکثر خوش ہو ہو کر اس کو اچھی خاصی بخشش بھی دیتا مگر زاہدہ کا دل ایک
انجانے خوف سے کانپ رہا تھا وہ سوچتی تھی کہ اگر کسی دن اختر میاں نے
میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں کیا کروں گی۔ اپنا ہاتھ چھڑا بھی نہ سکوں گی اور پھر گناہ کی
اس گندگی میں پھنس جاؤں گی جس سے ابھی نجات ملی تھی وہ اختر کی بڑھتی ہوئی دلچسپی
کا ذکر فیاض سے بھی نہ کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی مالکن سے کچھ کہہ سکتی تھی وہ عجیب
کشمکش میں تھی۔ ایک دن وہ گوشت بھون رہی تھی گرمی کی وجہ سے اس کا
چہرہ تمتما رہا تھا دوپٹہ اس نے گرمی کی وجہ سے صرف سر پر ڈال رکھا تھا اسی
دوران میں اختر بھی آگیا۔ زاہدہ نے گھبرا کر دوپٹہ لپیٹ لیا۔ اختر مسکرانے
لگا اور پاس ہی بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"زاہدہ آج تمہیں میری ایک بات کا جواب دینا ہی ہوگا۔"

زاہدہ:۔ (گھبرا کر) جی جی کیا۔

اختر:۔ یہی کہ تم مجھے دیکھ کر گھبرا کیوں جاتی ہو تمہارے چہرے
کی سرخی ایک دم پھیکی کیوں پڑ جاتی ہے۔

زاہدہ کچھ جواب نہ دے سکی بلکہ اس نے دیگچی میں چمچا اس زور سے چلایا کہ دیگچی زمین پر آ رہی۔ زاہدہ کی ہوائیاں اڑ گئیں اور اسی وقت اختر کی اماں بھی آ گئیں وہ سارا گوشت بکھرا ہوا دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئیں اور بولیں۔

"ارے کمبخت کھا کھا کر ہاتھی ہو رہی ہے کیا دیگچی سے کشتی لڑی تھی۔"

"اماں ابھی زاہدہ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اختر نے کھڑے ہو کر کہا۔

"اماں جی آپ اس بیچاری پر کیوں خفا ہو رہی ہیں یہ تو مجھ سے گری ہے۔ میں جلدی میں دیگچی کو اتار رہا تھا کہ میرا ہاتھ جل گیا۔"

"بیگم صاحبہ نے ایک دم رخ بدل دیا اور کہنے لگیں۔

"اختر میاں تم بھی ہوائی گھوڑے پر سوار رہتے ہو میں زاہدہ کو نہ جانے کیا کیا کہہ گئی ہوں۔"

زاہدہ دل میں اختر کی بڑی شکر گزار تھی کیونکہ اس نے تمام بلا اپنے سر لے لی اور وہ بعض طعن سے بچ گئی۔ کچھ دن اسی طرح گذرتے رہے کہ اختر زاہدہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا اور زاہدہ آنے والے طوفان سے خوفزدہ

رہنے لگی جس کی پیٹین گوئی اختر کی آنکھیں کر رہی تھیں ایکدن بیگم صاحبہ کی معہ تمام افراد کے کہیں دعوت تھی اور وہ صبح ہی سے وہیں گئی ہوئی تھی اختر چونکہ کالج گیا ہوا تھا اس لئے وہ نہ جا سکا تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا زاہدہ صحن میں جھاڑو دے رہی تھی کہ اختر آ گیا نہ جانے کیوں زاہدہ سہم سی گئی اس کے ہاتھ بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑنے لگے اختر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے زاہدہ کو آواز دی زاہدہ کا تو دم ہی نکل گیا۔ اختر نے دوسری آواز دی اور پھر تیسری آواز پر زاہدہ کو کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے اختر کے کمرے میں جانا پڑا۔ وہ کمرے میں پہنچی تو اختر نے کہا۔

زاہدہ یہاں آ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ آج تو کتنے دن بعد تم سے بات کرنیکا موقع ملا ہے۔

زاہدہ: مگر مجھے آپ نے کس لئے بلایا ہے حکم دیجئے نا۔

اختر: ارے زاہدہ بھئی تو اور حکم ابھی تو تمہارے دن ہیں کہ تم حکم دو اور دوسرا اپنا سر جھکائے

زاہدہ: اختر میاں میں نے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔

اختر: مگر تم آخر گھبرا کیوں رہی ہے کام تو ہوتا ہی رہتا ہے اور اب تو میں نے اماں جی سے کہدیا ہے کہ وہ ایک اور ملازمہ رکھ لیں۔

زاہدہ: آپ کا شکریہ مگر ......

اختر: (بات کاٹ کر) پھر وہی اگر مگر۔ آخر تم مجھ سے بات کرنے میں اس قدر گھبرائی کیوں ہو لیکن میں اتنا بد شکل نہیں کہ تم میری صورت دیکھ کر ڈر جاؤ

زاہدہ: خدا کے لئے اختر میاں مجھ سے میرا سکون نہ چھینئے۔ مجھے

پاکیزہ زندگی گزارنی ہے اور آپکا بھی فرض ہے کہ آپ مجھے اس بات کا موقع دیں۔

اختر:۔ ارے تم کسقدر بیوقوفوں کی سی باتیں کرتی ہو یہ ۱۸۵۷ء کی باتیں تھیں، اس دور میں پاکیزہ اور غیر پاکیزہ کوئی چیز نہیں۔

زاھدہ:۔ میرا خاوند ابھی زندہ ہے اور وہ مجھ سے ناراض ہے۔

اختر:۔ ارے وہ خاوند ہی کیا جو بیوی کو اس حال پر پہنچا دے تم اسے بھول جاؤ اور مجھے اپنا لو۔

زاھدہ:۔ میں ایک کی ہو چکی ہوں اور اب کسی دوسرے کو نہیں اپنا سکتی۔

اختر:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے زیادتی پر مجبور کر رہی ہو۔

زاھدہ:۔ یہ آپکی محبت کا زندہ ثبوت ہے کہ آپ زیادتی کرنے پر بھی تیار ہیں۔

اختر:۔ مگر میرے دل میں جو آگ بھڑک رہی ہے اس کا کیا علاج ہے۔

زاھدہ:۔ اگر آپ کے دل میں آگ کسی کی زندگی کو خاکستر کرنے پر قدرت رکھتی ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ سوائے اس کے کہ یہ ظلم ہے اور ظلم کرنا انسان کا کام نہیں ہے۔

اختر:۔ زاہدہ میں حیوان بننے کو تیار ہوں مگر اب ہی تمہیں اس کمرے سے باہر جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں۔

زاھدہ:۔ آپ ایک مجبور عورت پر جو آپ ہی کے ٹکڑوں پر گذر کر رہی ہے، ظلم کرنا چاہتے ہیں مگر یہ نہ بھولئے اختر میاں کہ سوکھے ٹکڑوں پر پلنے والی باعصمت عورت اپنی عصمت کی حفاظت میں بھوکی شیرنی سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے

اختر:۔ اوہو تو اب تم دھونس بھی دینے لگیں مگر تمہاری یہ دھونس میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تمہیں آج میرے جذبات کی آبرو رکھنی ہوگی۔

یہ کہکر زاہدہ کا ہاتھ اختر نے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا زاہدہ نے مزاحمت کی مگر ابھی دست درازی کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی اختر نے زاہدہ کو چھوڑ دیا۔ مگر اس سے یہ بھی کہدیا۔

"کہ اگر آج رات کو تم میرے پاس نہ آئیں تو کل صبح تمہارا حشر دنیا دیکھے گی"

بیگم صاحبہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی سنائی شروع کردیں اس نے دیکھا کہ ابھی تک جھاڑو بھی نہیں دی جب تک اس کے سر پر ڈنڈا نہ ہو حرامزادی کام ہی نہیں کرتی۔

زاہدہ نے جلدی جلدی جھاڑو دینی شروع کردی مگر اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ بات چکر لگا رہی تھی کہ صبح کو کیا ہوگا اگر وہ آج رات اختر میاں کے پاس نہ گئی تو کیا گل کھیلیگا۔ اختر میاں کے پاس کون سا ایسا ہتھیار ہے جو وہ کل استعمال کر سکتے ہیں وہ بڑی بے چین تھی اور اسی بے چینی کے عالم میں رات ہوگئی جب وہ کھانا لیکر اپنے کمرے میں آئی تو فیاض نے ایکدم خوشخبری سنائی کہ میری تنخواہ پچاس روپے ہوگئی ہے مگر زاہدہ نے خاطر خواہ خوشی کا اظہار نہ کیا فیاض نے محسوس کیا کہ زاہدہ کچھ پریشان سی ہے اس لئے وہ خاموش ہوگیا اور مزید زاہدہ سے بات نہ کرسکا مگر تھوڑی ہی دیر بعد زاہدہ فیاض سے بولی۔

"فیاض تم نے کیا کہا۔ تمہاری تنخواہ پچاس روپے ہوگئی ہے"

فیاض:۔ ہاں باجی آج سے پچاس روپے ہوگئی ہے۔

زاھدہ:۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ مگر فیاض یہ تو بتاؤ کہ کہیں رہنے کی جگہ بھی مل سکتی ہے۔؟

فیاض:۔ کیوں باجی خیر تو ہے۔ کیا یہاں سے جی اکتا گیا ہے۔

زاھدہ:۔ نہیں کام سے تو میں جی نہیں چراتی اس سے دوگنا کام بھی ہو تو کرلوں گی مگر اب یہاں رہنا نہیں چاہتی اور کل ہی چلا جانا چاہتی ہوں۔

فیاض:۔ آخر کیوں باجی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

زاھدہ:۔ بس یہ نہ پوچھو بھیا۔ یہ بتاؤ کہ کہیں رہنے کی جگہ بھی مل سکتی ہے۔

فیاض:۔ ہاں مل سکتی ہے مگر آٹھ روپے ماہوار سے کم کرایہ کا کوئی مکان نہیں مل سکتا۔

زاھدہ:۔ فیاض بلا سے تم کل مکان لے لو ادھر تمہاری تنخواہ بڑھ گئی ہے ادھر کچھ روپیہ میرے پاس جمع ہے اور پھر میں کہیں اور نوکری بھی کرلوں گی سب گذر ہو جائے گی۔

فیاض:۔ انشاء اللہ باجی میں کل تک مکان کا انتظام کرلوں گا۔

زاہدہ نے اپنی پونجی پر نظر ڈالی تو پورے نو سو روپے تھے یہ چودہ مہینے کی دونوں بہن بھائی کی تنخواہ اور دو سو روپے وہ تھے جو ڈپٹی صاحب نے اس کے بچے کے حادثے پر دیئے تھے زاہدہ نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اس کی زندگی کے تاریک دن ختم ہو گئے دونوں اطمینان سے سو گئے فیاض تو صبح ہی اٹھکر مکان کی تلاش میں چلدیا اور زاہدہ نے بیگم صاحبہ سے کہا۔

"میں آپ کی بہت شکر گذار ہوں کہ آپنے میرے ساتھ وہ سلوک کیا

جو میرے اپنے نہ کر سکتے تھے میں یہاں بہت خوش رہی مگر ایک مجبوری ایسی آ پڑی ہے کہ مجھے جانا ہی پڑ رہا ہے اگر آپ اجازت دیں تو چلی جاؤں۔

بیگم صاحبہ نے تعجب سے پوچھا۔

"مگر بیٹی وہ مجبوری کیا ہے۔۔۔۔"

کیا بتاؤں کچھ ایسے ہی گھریلو جھگڑے ہیں یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرے شوہر ناراض ہو کر لاہور چلے گئے تھے اب انھوں نے واپس آنے کیلئے یہ شرط لگائی ہے کہ میں نوکری چھوڑ کر رہائش بھی منتقل کر دوں۔

بیگم صاحبہ :۔ اچھا بیٹی تمہاری مرضی کل کو یہ نہ کہنا کہ بیگم صاحبہ نے نکال دیا تم اپنی خوشی سے آئی تھیں اپنی خوشی سے جا رہی ہو۔ البتہ یہ مجھے ضرور افسوس رہے گا کہ تمہارا بچہ میری وجہ سے گیا مگر اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی۔

زاہدہ :۔ اجی اب اس کا کیا ملال آپ نے کوئی جان بوجھ کر تھوڑا ہی ایسا کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر مختصر سا سامان درست کر کے وہ چاہتی تھی کہ اختر میاں کے کالج کے آنے سے پہلے یہاں سے چلی جائے اسی لئے وہ فیاض کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگی دس بجے کے قریب فیاض آیا اور کہنے لگا۔

"چلو باجی مکان مل گیا"

زاہدہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی وہ سب سامان تانگے میں رکھوا کر بیگم صاحبہ کو سلام کرنے اندر آئی۔ بیگم صاحبہ نے سترہ روپے تنخواہ کے

اور پانچ زائد دیئے اور کہا ر

زاہدہ موقع ملا کرے تو آتی رہنا ر"

اور زاہدہ "جی اچھا" کہکر رخصت ہوگئی ر

وہ اپنے نئے مکان میں آگئی ۔ اس نے آتے ہی چولہا جلایا اور اس پر حلوا پکایا اس کے بعد فیاض سے دوسری چیزیں منگائیں ر تاکہ چند مسکینوں کو کھانا کھلا سکے ر

ادھر جب اختر کالج سے آیا تو اسے معلوم ہوا کہ زاہدہ چلی گئی اسے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو وہ اپنا انتقام بھی نہ لے سکا اس نے کچھ سوچا اور جب اس کی اماں کسی کام میں لگ گئی تو اس نے اندر جاکر چپکے سے اپنی اماں کا نیکلس صندوقچی میں سے نکال کر اوپر جاکر اپنے کمرے میں ایک میز کی دراز میں رکھدیا اور پھر نیچے آکر کہنے لگا ر

" اماں جی زاہدہ کا ایک دم چلا جانا ضرور کوئی اہمیت رکھتا ہے آپ نے اپنے زیور وغیرہ بھی دیکھ لیئے ہیں یا نہیں ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ لیکر چلدی ہو ر"

بیگم صاحبہ :۔ اے ہے اختر میاں وہ ایسی نہیں تھی ۔ آدمی کی قدر چلے جانے یا مرنے سے معلوم ہوتی ہے آج سارا کام مجھے کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ وہ کتنا کام کرتی تھی ر

اختر :۔ مگر امی جی اس میں حرج کیا ہے کہ آپ اپنی سب چیزوں پر ایک نظر ڈال لیں ر

بیگم صاحبہ:۔ اچھا اچھا۔ میاں دیکھ لوں گی ذرا رد ّی کے دھندے سے تو نپٹ لوں۔

اختر:۔ مگر اماں جی میرا دل کہہ رہا ہے کہ ضرور کوئی بات ہے یہ تو کام دھندا ہوتا ہی رہے گا۔ آپ ایک دو منٹ کے لئے دیکھ تو لیجیے کہیں ایسا نہ ہو کہ زاہدہ کسی دوسرے شہر نکل جائے اور آپ ساری عمر پچھتائیں۔

بیگم صاحبہ:۔ توبہ نہ جانے تمہیں کیا لگ گئی ہے لو دیکھ لیتی ہوں"

یہ کہکر بیگم صاحبہ اٹھیں اور سب سے پہلے انھوں نے اپنے زیورات کا اٹیچی کیس کھولا۔ اٹیچی کیس کو کھولنا تھا کہ بیگم صاحبہ چیخ اٹھیں۔ ارے ہے میرا نیکلس نہیں ہے۔

اختر:۔ میں نہ کہتا تھا۔ اماں جی۔ اور چیزیں تو دیکھیے۔

بیگم صاحبہ:۔ ارے اختر میاں تم سچ کہتے تھے سب چیزیں موجود ہیں صرف نیکلس غائب ہے۔

اختر:۔ تو اب کیا ہوگا۔

بیگم صاحبہ:۔ کچھ بھی ہو اس حرامزادی کا پتہ لگاؤ۔ میرا تو چار ہزار روپے کا نیکلس تھا۔

سارے گھر میں شور مچ گیا کہ زاہدہ بیگم صاحبہ کا نیکلس چراکر چلدی۔ تھانہ میں رپورٹ لکھائی گئی اور زاہدہ کی تلاش شروع ہوگئی

چار بجے کے قریب جبکہ زاہدہ کے یہاں مسکین کھانا کھا رہے تھے تو پولیس پہنچ گئی پہلے تو مکان کی تلاشی لی مگر مکان میں سے کچھ نہ نکلا تو اسے پکڑ کر ڈپٹی صاحب کے حضور لایا گیا۔ ڈپٹی صاحب بھی اس خیال کے تھے کہ زاہدہ ایسا نہیں کر سکتی۔ مگر جب انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ اس گھر میں سوائے اس کے کوئی اور نہیں آیا تو ڈپٹی صاحب کو بھی یقین کرنا پڑا۔ اب زاہدہ کو ڈپٹی صاحب کے سامنے لایا گیا تو وہ بولے۔

"زاہدہ میں تم سے یہ امید نہیں کر سکتا تھا۔ میں تجھے بہت نیک سمجھتا تھا مگر آج تو نے دنیا سے نیکی کا بھرم کھو دیا۔"

زاہدہ تو جان ہی گئی تھی کہ یہ سب اختر میاں کے انتقام کی کوشش ہے اس لئے اس نے آبدیدہ ہو کر ڈپٹی صاحب سے کہا۔

"اگر حضور اجازت دیں تو میں اکیلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

ڈپٹی صاحب:۔ ہاں اجازت ہے اور زاہدہ کو ساتھ لیکر اپنی بیٹھک میں آ گئے۔ اور کہا۔

"زاہدہ میں تیرے ساتھ صرف یہ رعایت کر سکتا ہوں کہ اگر تو جرم کا اقرار کر لے اور نیکلس مجھے دیدے تو میں تجھے کچھ نہ کہوں گا۔"

زاہدہ نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

"سرکار یہ تو لعب کی بات ہے مگر میری صرف اتنی سی گذارش ہے کہ آپ میرے ساتھ چل کر اختر میاں کے دونوں کمروں کی تلاشی لیں۔"

ڈپٹی صاحب یہ سنکر آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے۔

"اری کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ اختر میاں نے چوری کی ہے۔ بدتمیز اسے کس چیز کی کمی ہے جو وہ چوری کریگا۔ آج تک وہی اس گھر میں رہتا تھا مگر اس نے پہلے تو کبھی ایسا نہ کیا اب وہ چوری کرے گا۔ تو یا تو صحیح بتا دے ورنہ میں پولیس سے کہوں گا کہ وہ تجھ سے مار لگا کر اقرار کرائیں۔"

زاہدہ نے ڈپٹی صاحب کے پیر پکڑ لئے اور سر رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے حضور کا نمک کھایا ہے میں اختر میاں پر الزام نہیں لگاتی مگر یہ میری درخواست قبول کر لیجئے تو میں بعد میں سب کچھ بتا دوں گی۔"

ڈپٹی صاحب:۔ آخر تیرا مطلب کیا ہے۔

زاہدہ:۔ میرا مطلب یہی ہے کہ اختر میاں کے دونوں کمروں میں سے نیکلس مل سکتا ہے۔

ڈپٹی صاحب:۔ مگر اس نے چوری کیوں کی؟

زاہدہ:۔ حضور اس کی وجہ میں بعد میں بتا دوں گی۔

آپ مجھے سولی پر چڑھوا دیں مگر میری درخواست قبول کر لیں۔

ڈپٹی صاحب سوچنے لگے کہ ماجرا کیا ہے اودھر زاہدہ کو یقین تھا کہ اختر میاں نے نیکلس نکال کر ضرور اپنے اوپر کے یا نیچے کے کمرے میں چھپا دیا ہے آخر ڈپٹی صاحب نے کہا۔

"اچھا مجھے تیری یہ بھی خواہش منظور ہے"۔

زاہدہ :- تو سرکار اختر میاں اب اندر یا باہر نہ آنے پائیں ،

ڈپٹی صاحب :- مجھے یہ بھی منظور ہے۔

اب ڈپٹی صاحب زاہدہ کو ساتھ لیکر پہلے اندر کے کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ جب وہاں کچھ نہ ملا تو اوپر والے کمرے میں گئے۔ زاہدہ دل ہی دل میں خداوند کریم سے کہہ رہی تھی "یا رب میرے گناہوں کی بہت سزا مل چکی ہے اب تو اپنی رحمت سے نواز دے۔ اے میرے پروردگار اب تو میری لاج رکھ لے تو بے خطاؤں کو کبھی سزا نہیں دیتا۔"

یہ لوگ اوپر والے کمرے میں پہنچے ڈپٹی صاحب خود ہر چیز دیکھ رہے تھے۔ اب جو دراز کھینچی تو اوپر ہی نیکلس رکھا تھا۔

ڈپٹی صاحب حیرت سے کبھی زاہدہ کو کبھی نیکلس کو دیکھتے نیکلس اٹھا کر وہ نیچے آئے اور کمرے میں زاہدہ کو بٹھا کر اور نیکلس بیگم صاحبہ کے ہاتھوں میں دے کر باہر آئے اور پولیس سے کہا کہ معاملہ نجی طور پر نپٹ گیا ہے اب آپ جا سکتے ہیں پولیس چلی گئی۔

اختر حیرت سے کھڑا اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اختر سے کہا۔

"اختر میاں جب تک ہم تمہیں اجازت نہ دیں اندر نہ آنا اور خود اندر آ گئے جہاں زاہدہ کو بٹھا کر گئے تھے۔ دیکھا تو بیگم صاحبہ نے زاہدہ پر گالیوں کی اور کوسنوں کی بوچھاڑ کر رکھی تھی۔ ڈپٹی صاحب نے روکا اور کہا۔

"تم تو آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ یہ بھی پتہ ہے کہ اس نیکلس کا چور کون تھا"؟

بیگم صاحبہ:۔ زاہدہ اور کون۔

ڈپٹی صاحب:۔ نہیں زاہدہ نہیں۔

بیگم صاحبہ:۔ تو پھر کون تھا

ڈپٹی صاحب:۔ چور تمہارا صاحبزادہ ہے۔

بیگم صاحبہ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں ،

ڈپٹی صاحب زاہدہ کو دوسرے کمرے میں لے گئے اور ماجرا پوچھا۔

تب زاہدہ بولی ۔ اگر حضور برا نہ مانیں تو پوری بات عرض کر دوں ۔

ڈپٹی صاحب نے وعدہ کیا ۔ تو زاہدہ نے کہا ۔

" سرکار بات اصل یہ ہے کہ اختر میاں کی نیت میری طرف سے .....

ڈپٹی صاحب :۔ ہاں ہاں کہو بیٹی ہم سب کچھ سنیں گے ۔ تمہیں اجازت دے چکے ہیں ۔

زاہدہ :۔ جی میں نے اختر میاں کو بہت سمجھایا مگر وہ ضد پر اتر آئے اور انھوں نے مجھے سوچنے کا صرف ایک رات کا موقع دیا اور کہا کہ اگر میری حسب منشا جواب نہ دیا تو کل میرا انتقام ....

ڈپٹی صاحب :۔ بس بس بیٹی ہم سمجھ گئے ،

زاہدہ :۔ بس اسی لئے حضور مجھے یہاں سے ملازمت چھوڑ کر جانا پڑا ....

ڈپٹی صاحب :۔ ٹھیک ہے زاہدہ ۔ اصل میں ہم تمہارے خطاوار ہیں ، اختر میاں کی تو میں ابھی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا ۔ آج میں تمہارا بدلہ اس سے لوں گا ۔

زاہدہ نے لجاجت سے کہا ۔

" سرکار اگر اس بات کو آپ یہیں ختم کر دیں تو اچھا ہے ۔ مار پیٹ سے بات بڑھے گی ۔ اور سوائے بدنامی کے کچھ نہ ہوگا ۔ آپ کو میری

بے گناہی کا یقین ہو گیا ہے۔ یہی میرے لئے بہت کچھ ہے اب خدا کے لئے اختر میاں سے کچھ نہ کہیں"

اتنے میں بیگم صاحبہ بھی آگئیں اور انھوں نے بدلا ہوا ماحول دیکھ کر ڈپٹی صاحب کو حیرت سے دیکھا،

ڈپٹی صاحب بولے،

"سن لیا تم نے۔ دیکھ لیا تم نے اپنے لاڈلے کی کرتوت، ایک بیچاری معصوم کی درگت بنوانے کا الزام بھی تمہارے ہی سر ہے،"

جب بیگم صاحبہ سر ہو گئیں تو ڈپٹی صاحب نے سارا قصہ سنا دیا اب تو بیگم صاحبہ بھی بیٹے کی کرتوتوں پر لال پیلی ہو گئیں اور غصہ میں باہر جانا چاہتی تھیں کہ زاہدہ نے دامن تھامتے ہوئے کہا،

"آپ کو میری بے گناہی کی قسم ہے اگر اختر میاں سے کچھ کہا۔ بس اب بات کو یہیں ختم کر دیجئے"۔

غرض کافی اصرار کے بعد ان دونوں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ ڈپٹی صاحب نے زاہدہ سے کہا کہ زاہدہ تم پھر یہاں آجاؤ۔ اب تمہیں شکایت نہ ہوگی، مگر زاہدہ نے کہا،

"اب تو مجھے علیحدہ ہی رہنے دیجئے کیونکہ میں اپنی زندگی کا رُخ بدل چکی ہوں"۔

اس بات پر کافی بحث رہی اور آخر زاہدہ واپس چلی آئی اور خدا کا شکر ادا کیا ادھر ڈپٹی صاحب نے اختر سے صرف اتنا کہا۔

"اختر میاں نیکلس تمہاری دراز سے مل گیا ہے" اور یہی جملہ اختر کو پانی پانی کر گیا۔

زاہدہ نے اپنے جھیٹے سے گھر میں آکر اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا فیاض صبح ہی کام پر چلا جاتا اور شام کو گھر واپس آتا۔ اب زاہدہ یہ چاہتی تھی کہ کس طرح اپنے جمع شدہ روپے سے کوئی کام شروع کر دے جس سے زندگی ایک مرتبہ پھر راحت و آرام کا جھولا جھولنے لگے، دن گذرتے رہے اور زاہدہ صرف پچاس روپے میں گذارہ کرتی رہی محلے والے بھی اس راز سے واقف ہو چکے تھے کہ زاہدہ کا شوہر جاوید اسے چھوڑ چکا ہے اور یہ زاہدہ مشہور و معروف فرزانہ کی بیٹی اور منیر کی منظورِ نظر ہے۔ یہ واقعات ان زندہ دل نوجوانوں کی ہمت افزائی کے لئے کافی تھے، جن کی صبح و شام کی کوشش محض کسی حسن کافر کو مسلمان کرنے میں گذرتی تھیں، چند نوجوانوں نے دروازے پر اڈہ جما دیا مگر زاہدہ کبھی کبھی دروازے پر آتی تھی جس سے نوجوانوں کی منشا پوری نہ ہو سکی، آخر ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے حنیف نے فیاض سے دوستی بڑھائی شروع کر دی اور ہوتے ہوتے حنیف کا گھر میں آنا جانا بڑھ گیا، پہلے پہلے تو زاہدہ نے سرسری سا پردہ رکھا اور بعد میں وہ سامنے آنے لگی اب حنیف اکثر یہیں کھانا کھاتا اور جو کھانا چاہتا زاہدہ کو لا کر دے دیتا، اس کے علاوہ وہ زاہدہ کے لئے کبھی پھل لاتا تو کبھی مٹھائیاں اور کبھی کبھی کوئی ریشمی سوٹ یا

ساڑی بھی اور پھر وہ زاہدہ سے اصرار کرتا کہ وہ اس لباس کو ابھی پہنے اور زاہدہ کو پہننا پڑتا۔

فیاض ابھی ان باتوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکتا تھا وہ ان تمام باتوں کو حنیف کی پرخلوص دوستی ہی تصور کرتا تھا۔ اب حنیف کا کافی وقت زاہدہ کے پاس گذرتا تھا۔ ایک دن وہ آیا۔ اور زاہدہ سے کہنے لگا۔

"چلو زاہدہ آج تمہیں میٹنی شو دکھا کر لائیں"

زاہدہ:۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی۔

حنیف:۔ دیکھو زاہدہ آج میرا دل سینما دیکھنے کو بہت چاہ رہا ہے اگر تم نہ جاؤ گی تو میں بھی نہ جاؤں گا۔

زاہدہ:۔ آپ میری وجہ سے کیوں نہیں جاتے۔ آپ چلے جائیے۔

حنیف:۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا اگر فیاض آگیا ہوتا تو اس کو بھی لے چلتا۔ اور اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔

زاہدہ:۔ نہیں اعتراض کیا ہوتا۔

حنیف:۔ تو چلو۔

زاہدہ:۔ مگر۔۔۔۔

حنیف:۔ مگر کیا۔ بتاؤ کیا بات ہے جو مجھ سے چھپا رہی ہو۔

زاہدہ:۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسا برقعہ

نہیں ہے جسے پہن کر آپ کے ساتھ چل سکوں۔

حنیف :۔ بس اتنی سی بات! یہ ڈبہ جو میں نے رکھا ہے اسے کھولو۔

زاہدہ :۔ ارے یہ برقعہ تو بہت عمدہ ہے۔

حنیف :۔ نہیں اس سے کیا، تم یہ دیکھو کہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

زاہدہ :۔ ٹھیک کیوں نہ ہوتا۔ بلکہ بہت اچھا ہے۔ آپ اتنا خرچ کرتے ہیں فیاض سے کہوں گی کہ وہ آپ کے ذرا کان پکڑے۔

حنیف :۔ یہ اختیار تو نہیں ہے۔ لو کھینچو کان اور مارو چپت۔

زاہدہ مسکرا کر خاموش ہو گئی اور کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ آج نہ جانے کیوں اس کی امنگیں دوبارہ ایک نئی زندگی پا رہی تھیں۔

وہ غسل کرتی رہی، غسل خانے سے باہر آئی تو بھی اس کے چہرے پر خوشی اور ہونٹوں پر مسرت کے گیت ناچ رہے تھے۔ جب اس نے لباس تبدیل کر لیا تو حنیف نے اپنی جیب سے ایک کاغذ کا تھیلا نکالا اور زاہدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

"لباس کے ساتھ ان چیزوں کی بھی ضرورت ہے تم اس سے کیوں محروم ہو"

زاہدہ نے تھیلا ہاتھ میں لے کر چیزیں نکالنی شروع کیں، لپ اسٹک، پاوڈر، کریم، گالوں کی سرخی، ناخن کی سرخی، سرمہ، عطر بندے اور انگوٹھی۔

زاھدہ:۔ ہیں یہ سب کیا ہے۔

حنیف:۔ کیوں کیا تم ان کے استعمال کی اہل نہیں ہو۔

زاھدہ:۔ مگر میں ان کو استعمال کرنا نہیں چاہتی۔

حنیف:۔ کیوں اور کس لئے تم کنواری تو ہو نہیں، شوہر زندہ ہے تو پھر کس کا ڈر۔

زاھدہ:۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر جاوید کے سامنے یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں۔

حنیف:۔ تم یہ مولویوں کے سے وعظ نہ کیا کرو۔ اگر ایسا ہے تو جنگل میں بیٹھکر رام رام شروع کر دو۔

زاہدہ کو ہنسی آگئی اور اس نے دو سال بعد پہلی مرتبہ اپنے چہرے کو غازہ اور سرخی سے نکھار دیا۔

زاہدہ نے بناؤ سنگار کے بعد جب آئینہ دیکھا اور اپنے جسم پر اوپر سے نیچے تک نظر ڈالی پھر اس نے آئینہ سے نظر ہٹا کر حنیف کو دیکھا اور حنیف اسے تکتا ہی رہ گیا۔ دونوں ایک ساتھ پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلے۔ بازار والوں نے دیکھا کر حنیف کا داؤ بیٹھ گیا اور وہ سب ایک نئی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ دونوں سنیما پہنچے اور ہال میں جا بیٹھے۔ ہر طرف زاہدہ کے جسم سے پھوٹی ہوئی خوشبوئیں لپک رہی تھیں۔ اور بار بار لوگوں کی نظریں اس جوڑے پر اٹھ رہی تھیں سنیما میں فلم بھی اس قدر رومان انگیز چل رہی تھی کہ یہ دونوں

اپنی اپنی جگہ انتہائی جذباتی ہو رہے تھے۔

فلم ختم ہوگئی اور ان دونوں میں ایک نئی فلم کا آغاز ہوگیا۔ دونوں کی نظریں تو محبت کی ترجمان تھیں مگر زبان ہنوز گنگ تھی۔ یہ دونوں گھر آگئے۔ زاہدہ نے کپڑے اتارنے کا ارادہ کیا تو حنیف نے کہا۔

"زاہدہ ابھی کپڑے نہ اتارو۔ صرف منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ سنگار کرلو"

زاہدہ :۔ کیوں۔

حنیف :۔ میری مرضی۔

زاہدہ :۔ اچھا نہیں اتارتی۔

جب زاہدہ باورچی خانے میں جانے لگی تو حنیف نے کہا۔

"زاہدہ فیاض کو آ جانے دو ہم تینوں آج ہوٹل سے کھانا منگا کر کھائیں گے۔"

آج حنیف سارا پروگرام طے کر کے آیا تھا۔ فیاض جس ڈاکٹر کے یہاں کام کرتا تھا وہاں حنیف کی کافی رسائی تھی۔ حنیف نے بڑے کمپاؤنڈر سے کہہ دیا تھا کہ وہ آج سیکنڈ شو میں فیاض کو لیکر ضرور جائے اور کسی طرح اس کا انکار قبول نہ کرے۔ شام کو جب فیاض آیا تو کہنے لگا۔

"باجی آج ہمارے کمپاؤنڈر صاحب ضد کر رہے ہیں کہ سینما دیکھنے

چلو، ذرا کھانا جلدی دیدو ان کے ساتھ جانا ہے"

زاہدہ:۔ اگر جانا ہی تھا تو پچھلا شو دیکھ آتے۔ اب رات کو ایک بجے تک اکیلی کیسے رہوں گی؟

ایک دم حنیف بول اٹھا،

"ارے زاہدہ تم تو سینما دیکھ آئیں۔ اب فیاض نے کون سا قصور کیا ہے جو اس کو روکتی ہو۔ فیاض تم پکچر دیکھ آؤ مجھے کالج کا کچھ کام کرنا ہے گھر کے بجائے یہیں کر لوں گا"

فیاض ایک دم چونک کر بولا،

"مگر حنیف باجی نے سینما کب دیکھا"؟

حنیف:۔ ارے بھئی میں انھیں ذرا باہر ہو کر میٹنی شو لے گیا تھا یار کوئی بات بھی ہو، مجھے بیچاری پر ترس آتا ہے، ہر وقت سوچ میں پڑی رہتی ہیں۔ نہ ہنسنا نہ بولنا۔ اگر ان کی یہی حالت رہی تو بس ٹی بی ہو جائے گی، اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اگر عورت اپنا رکھ رکھاؤ ٹھیک نہ رکھے تو شوہر کیا خاک اسے چاہے گا، کبھی تو جاوید واپس آئیں گے اور جب ان کی نظریں پڑیں گی تو ساری خوشتر اور پری پیکر کی صورت بھول جائیں گے۔

فیاض:۔ ہاں حنیف یہ تو ٹھیک ہے میں تو خود ان سے کہتا ہوں کہ تم ہنستی بولتی رہا کرو۔ مگر نہ جانے یہ کیوں ہر وقت اللہ سے لو لگائے خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔

حنیف :۔ بھئی فیاض میں تو جتنا تمہیں چاہتا ہوں اتنا ہی انھیں چاہتا ہوں اب اگر تم لوگ مجھ سے غیریت برتو تو دوسری بات ہے۔

فیاض :۔ واہ بھئی عجیب ہیں آپ بھی۔ ارے ہم تو خود اس دنیا میں خلوص و محبت کے بھوکے ہیں۔ پھر غیریت کا کیا سوال ہے۔

حنیف :۔ نہیں میں نے اس لئے کہا کہ کہیں تم یہ اعتراض نہ کرو کہ میرے بغیر سنیما کیوں لے گئے تو بھئی میں نے انھیں آج بہت افسردہ دیکھا اور ان کا دل بہلانے کی خاطر میں سنیما لے گیا۔

فیاض :۔ ارے تو کون اعتراض کرتا ہے مجھے معلوم ہے کہ باجی کا مجھ سے زیادہ آپکو خیال ہے پھر اس میں اعتراض کیا۔ اعتراض تو غیر سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔ ہوٹل سے کھانا آگیا اور تینوں نے سیر ہوکر کھایا ابھی کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ کمپاؤنڈر نے آواز دی اور فیاض چلا گیا۔ اب حنیف اور زاہدہ اکیلے ہی تھے کچھ دیر بعد حنیف نے سگریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"زاہدہ ذرا جلادینا"

زاہدہ :۔ مجھے جلانا نہیں آتا۔ آپ خود جلائیے۔

حنیف :۔ زاہدہ! تم بھی دنیا میں کیا کر سکتی ہو۔ ایک سگریٹ بھی نہیں جلا سکتیں۔ اچھا یہاں آؤ میں تمہیں سگرٹ جلانا بتاؤں۔

حنیف نے یہ جملہ اس انداز سے کہا کہ زاہدہ اسے منع کرنے کی جرأت نہ ہو سکی اور وہ قریب آ گئی۔ حنیف نے سگرٹ اس کے ہونٹوں سے اس طرح لگایا کہ اس کی انگلیاں زاہدہ کے ہونٹوں سے مس ہو گئیں۔ زاہدہ کے چہرے پر تمتماہٹ آ گئی، اور جب حنیف نے ماچس جلا کر زاہدہ سے کہا "سانس اندر لو" تو سگرٹ اس کے ہونٹوں سے کانپ کر گر گئی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔

یہ مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ اپنے پہلو میں لاکھوں داستانیں لئے ہوئے حنیف نے زمین پر سے سگرٹ اٹھا کر خود جلائی اور زاہدہ سے کہا۔

"لو پیو"

زاہدہ :۔ نہیں نہیں بس نہیں پیتی۔ منہ میں بدبو ہو جائیگی۔

حنیف:۔ ارے بدبو نہیں آئے گی۔ خوشبو ہو جائے گی۔ ذرا میرا منہ سونگھ کر دیکھو کیا بدبو آتی ہے"

اور جب زاہدہ نے حنیف کا منہ سونگھنے کے لئے اپنا چہرہ آگے بڑھایا تو نہ جانے کیوں اس کی سانس اس قدر تیز ہو گئی کہ وہ اس کا منہ نہ سونگھ سکی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح دوسرے پلنگ پر جا بیٹھی۔

حنیف نوعمر ضرور تھا مگر اس تھوڑی سی عمر میں بہت ہی مرحلے طے کر چکا تھا وہ زاہدہ کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اور ہر چیز کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ زاہدہ کو گھورتے ہوئے بولا۔

" زاہدہ دل کی بات زبان پر نہ لانا بہت بڑا ظلم ہے اور زاہدہ جیسے چونک سی گئی ہو" وہ کہنے لگی۔

"جی نہیں تو۔ میرے دل میں تو کوئی بات نہیں۔

حنیف:۔ نہیں زاہدہ تم چھپا رہی ہو۔ کچھ تو ضرور ہے۔ کہہ دو نا۔ میری اچھی زاہدہ۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔

زاہدہ:۔ نہیں نہیں حنیف صاحب کچھ بھی تو نہیں۔

حنیف:۔ صرف حنیف کہو۔

زاہدہ:۔ اچھا حنیف ہی سہی مگر.....

حنیف:۔ تم میری جان کی قسم کھا کر کہہ دو کہ تم مجھ سے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔

زاہدہ:۔ آپ کی جان کی قسم کیوں کھاؤں۔ آپ کی جان پر

مجھے کیا اختیار ہے۔ ہاں میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں۔"

حنیف نے ذرا جذباتی ہو کر اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"زاہدہ نہ میری جان میری ہے اور نہ تمہاری جان تمہاری بلکہ تمہاری جان میری ہے اور میری جان تمہاری کہو ٹھیک ہے نا؟"

زاہدہ نے گردن جھکا دی اور اس کے ہونٹ اس طرح کھل کر رہ گئے جیسے وہ "جی" کہہ رہی ہو۔ اور اسی خیال نے ایک طوفان کو جنم دیا دونوں ان لہروں سے ٹکرانے اور ہچکولے کھانے لگے۔ سمندری جوار بھاٹا رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ لہریں ساکت ہو گئیں۔

فیاض فلم دیکھ کر گھر آ چکا تھا اور حنیف رخصت طلب لگا ہوں سے اپنے گھر چلا گیا۔

زاہدہ دوبارہ تاریک اور گھناؤنے ماحول کو اپنا چکی تھی اور یہ بھول چکی تھی کہ پچھلی لغزش پر خداوند عالم کے کس بھیانک عتاب کا نشانہ بن چکی تھی۔

وہ غلاظتوں میں آگے بڑھتی جا رہی تھی اور فیاض بھی سب کچھ سمجھتے ہوئے چشم پوشی کر رہا تھا یا یوں کہو کہ وہ بھی اسی ماحول میں رنگتا جا رہا تھا۔

کچھ دنوں حنیف کی آمد و رفت جاری رہی مگر پھر بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ شاید اس لئے کہ اکرم کی آمد نے اس کو پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا ہو مگر زاہدہ کبھی کبھی حنیف کو یاد کر ہی لیتی تھی۔ اور حنیف اسی

شدت محبت سے اس کی فرمائش کر دیتا تھا۔ اکرم کو بھی زاہدہ سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اس طرح کہ ایک دن اکرم اپنی کار میں بیٹھا ہوا ایک ہوٹل کے سامنے کافی پی رہا تھا اور اس کی کہنی باہر نکلی ہوئی تھی اور اسی ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی زاہدہ ادھر سے گزری اور اس کا کندھا اتفاقاً اکرم کی کہنی سے ٹکرایا اور تمام کافی اس کے عمدہ سوٹ پر گر گئی۔

پیالی گرنے کی وجہ سے قدرتاً زاہدہ ٹھہر گئی اور زاہدہ نے غیرارادی طور سے اپنا نقاب اٹھاتے ہوئے معافی چاہی۔ اکرم دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

"اگر آپ چہرے سے نقاب ہٹا کر معافی نہ چاہتیں تو شاید میں معاف کرنے کی یک لخت جرأت نہ کر سکتا تھا"

زاہدہ نے گھبرا کر نقاب چہرے پر ڈال لی۔ اس وقت فیاض بھی زاہدہ کے ساتھ تھا۔ فیاض نے بھی معافی چاہی اور اکرم نے اس رسم معافی کو طول دینے کے لئے پوچھا"

اگر آپ لوگ گھر جا رہے ہوں تو بلاتکلف کار میں آجائیے میں بخوشی آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں گا مگر اس شرط پر کہ آپ میرا کوٹ دھلوانے کے لئے پانی اور صابن مہیا کر دیں۔ فیاض کے لئے انکار کرنے کی گنجائش نہ تھی وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ اور زاہدہ محلے میں پہلی مرتبہ ایک نفیس کار میں سے اتر کر گھر آگئی۔ گھر میں آکر زاہدہ نے اکرم سے پردہ نہ کیا اس نے بے تکلفی سے صابن اور پانی کی فرمائش کی۔

زاہدہ نے کوٹ اپنے ہاتھوں میں لےکر دھونا شروع کیا،
اور اکرم کو اعتراض نہ ہوا، کوٹ سوکھنے کے لئے ایک طرف لٹکا دیا
فیاض نے کہا،
"اکرم صاحب آپکو کافی میں پلاتا ہوں"۔
یہ کہکر وہ بازار سے کافی خریدنے چلاگیا اور اکرم کو زاہدہ سے کچھ
اور بے تکی باتیں کرنے کا موقع مل گیا،
اکرم نہ صرف جوان اور وجیہہ تھا بلکہ شہر کا کافی مالدار بزنس مین
تھا۔ اس نے کافی پی اور چلتے وقت سو روپے کا نوٹ نکالتے
ہوئے زاہدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،
"یہ کوٹ دھونے کا معاوضہ ہے"
زاہدہ :۔ نہیں نہیں میں نہیں لوں گی،
اکرم :۔ کیوں کیا بات ہے،
زاہدہ :۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی ایک تو کوٹ خراب ہو
گیا اور دوسرا یہ سو روپے لے لوں،
اکرم :۔ ارے صاحب ایسے ہزار کوٹ بھی خراب ہوجائیں
تو کیا ہے میں نے تو صرف آپ لوگوں سے رسم بڑھانے کی وجہ سے
کوٹ کا اتنا تومار باندھ دیا، کیوں کہ آپ حضرات میں خلوص دیکھا
اس لئے طبیعت چاہی کہ تعلقات بڑھاؤں،
ورنہ یہ کوئی بات نہیں،

فیاض نے کہا،

" ہاں ہاں صاحب آپ شوق سے تشریف لا سکتے ہیں۔ مگر اس تکلیف کی ضرورت بالکل نہیں "۔

" اکرم نے زبردستی وہ نوٹ زاہدہ کے بالوں میں الجھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس کا قبول نہ کرنا میری دل شکنی ہوگی "۔

اس سے بات آئی گئی ہوگئی اور وہ چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد حنیف آگیا اور اس نے پوچھا۔

" یہ کون صاحب آئے تھے اور کیوں آئے تھے "؟

زاھدہ :۔ اکرم صاحب تھے۔

حنیف :۔ کون اکرم ؟

زاھدہ :۔ شہر کے بڑے بزنس مین ہیں۔

زاہدہ نے تمام قصہ حنیف کو سنا دیا مگر سو روپے کا ذکر نہ کیا۔ مگر حنیف کو کھٹک گئی کہ اکرم کا یہاں آنا اور کافی پی کر جانا خالی از علت نہیں ہے، وہ چپ ہو گیا اور کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے دن مغرب کے وقت کار کا ہارن بجا فیاض ابھی تک نہیں آیا تھا۔ زاہدہ نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا تو اکرم تھا۔ اس نے اندر بلا لیا۔

اکرم نے بڑی گہری نظروں سے زاہدہ کو دیکھا، وہ اس وقت یورپی انداز میں ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ یہ لباس حنیف کو بہت

پسند تھا اور اسی نے یہ سب سامان لاکر دیا تھا مگر آج خیف کے لائے ہوئے تیر اکرم کے کام آرہے تھے۔

اکرم نے حسن کے بڑے بڑے مجسمے دیکھے تھے۔ وہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

اب زاہدہ کے مکاں سے غربت نہ ٹپکتی تھی بلکہ امارت کا یقین ہوتا تھا۔

مختصر سا گھر تھا جس میں صرف دو کمرے تھے۔ صحن کے بعد باورچی خانہ، غسل خانہ، پاخانہ اور ایک کوٹھری تھی ان دونوں کمروں میں سے ایک کمرہ فیاض کا تھا جس میں اس کی خوبصورت مسہری پڑی تھی اور صوفہ سیٹ تھا۔ ایک سنگار میز لگی ہوئی تھی اور فرش پر دری کے ساتھ ساتھ قالین بچھے تھے۔ دیواروں پر حسین تصاویر اور خوبصورت سینریاں آویزاں تھیں ایک کونے میں آرام کرسیاں اور وسط میں چائے کی میز، دو طرف کپڑوں کی الماریاں اور ان کے بیچ میں سنگار میز جس پر تمام مغربی سنگار کی چیزیں سجی ہوئی تھیں اس میز پر ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ اور ایک فانوس وسط چھت میں لٹکا ہوا تھا تین چار کھونٹیاں تھیں جن پر اور کپڑے لٹکے ہوئے تھے ایک اسٹینڈ پر تولیا رکھا ہوا تھا۔ مسہری کے سرہانے ایک رنگین بلب فٹ تھا اور دیواروں پر یہاں بھی سینریاں آویزاں تھیں غرض دونوں کمرے آراستہ پیراستہ

تھے۔ ایک بوڑھی خادمہ بھی ملازم رکھی تھی اور یہ کہنے میں کوئی باک نہ ہوگا کہ تمام آسائشیں محض حنیف کے دم سے تھیں۔ حنیف نے اپنے والدین کا ہزاروں روپیہ زاہدہ کی ادنیٰ سی فرمائشوں پر نثار کر دیا تھا۔

زاہدہ بھی فرمائشیں کرنے میں ماہر ہوگئی تھی۔ جب اکرم صوفے پر بیٹھ گیا تو زاہدہ نے بوڑھی ملازمہ کو چائے بنانے کا حکم دیا اور پھر آکر بیٹھ گئی۔ اتنے میں فیاض بھی آگیا۔ اب تھوڑی دیر کے لئے اکرم اور فیاض میں گفتگو ہونے لگی۔

اکرم نے پوچھا۔

"بھئی فیاض صاحب آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں"۔

فیاض:۔ جناب میں ایک ڈاکٹر کے پاس کام کرتا ہوں اور روزانہ اس وقت چھٹی ہوتی ہے۔

اکرم:۔ کیا تنخواہ ملتی ہے۔

فیاض:۔ اب تو نوے روپے ملتے ہیں۔

اکرم:۔ بس اور اس میں تم لوگوں کی کیسے گذر ہوتی ہے۔

فیاض:۔ ارے صاحب آپ یہ بھی تو پوچھئے کہ جب مجھے تیس روپے ملتے تھے۔ اس وقت کیسے گذر ہوتی تھی۔

اکرم:۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔

فیاض:۔ ہاں صاحب مگر کون خیال کرتا ہے۔

اکرم :۔ بات کیا ہے۔

فیاض :۔ بس بات کیا ہے کچھ گذشتہ واقعات ایسے ہوئے کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور پھر والدہ صاحبہ چل بسیں انھیں (زاہدہ کی طرف اشارہ کر کے) سسرال راس نہ آئی اور ہمارے بہنوئی چھوڑ کر چل دیئے۔ سارا اثاثہ ختم ہو گیا۔ میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا مجھے مجبوراً پڑھائی چھوڑ دینی پڑی اور ملازمت کی۔ خدا نے وہ وقت گزار دیا۔ اب خدا کا شکر ہے اور اس میں سب سے بڑا ساتھ میرے دوست حنیف نے دیا وہ بہت ہی دوست پرست تھے انھوں نے چھوٹے چھوٹے بزنس میں میرا پیسہ لگایا اور کافی منافع دیا۔ یہ حالت کیا تھی اور کیا ہو گئی۔

اکرم :۔ واقعی تم نے بہت تکلیف اٹھائی۔ میرا خیال ہے کہ اب تم ڈاکٹر صاحب کی نوکری چھوڑ دو۔

فیاض :۔ نوکری چھوڑ دوں تو پھر کیا کروں۔

اکرم :۔ میرے پاس اور میرے جنرل اسٹور کی منیجری کرنا۔ کہو۔ کیا۔ منظور ہے۔

فیاض :۔ اچھا! جیسے آپ کی مرضی۔

اکرم :۔ بھئی میں صاف گو آدمی ہوں۔ اور یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ فی الحال میں دو سو روپے دوں گا اور اس کے بعد تمہاری دیانت داری اور محنت کا اندازہ لگا کر اور بھی تنخواہ بڑھا دوں گا۔ اس طرح آپ

کی تمام مشکلات ختم ہو جائیں گی۔

فیاض:۔ میں آپ کا کن الفاظ سے شکریہ ادا کروں۔

اکرم:۔ شکریہ کی کوئی بات نہیں میں بحیثیت دوست کے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ مالکانہ طور پر نہیں۔

بعد میں وہ زاہدہ کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔

"آپ کی کہانی بڑی المناک ہے اچھا بات کیا ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کے شوہر نے آپ پر ستم کا پہاڑ توڑا۔"

زاھدہ:۔ بس بات کیا ہوتی بازاری عورتوں کے حسن میں پھنس گئے تھے۔ ایک طوائف انھیں اپنے ساتھ لاہور لے گئی اور پھر آج تک پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

اکرم:۔ واقعی صاحب یہ صرف آپ کا ہی دل تھا کہ اتنی سخت داستان جھیل گیئں۔ ورنہ دوسرا تو نہ جانے کیا کیا کرتا۔

زاھدہ:۔ اب اگر کچھ کیا بھی جائے تو کس لئے۔ خدا کا شکر ہے جب تک کھیا ہے مجھے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ اور یہی عورت کی مجبوری ہے جس کی وجہ سے عورت کو مردوں کی ہرجا اور بے جا باتوں پر گردن جھکانی پڑتی ہے۔

اکرم:۔ مگر میں اس کا قائل ہوں کہ عورتوں اور مردوں کے برابر کے حقوق ہونے چاہئیں۔

زاھدہ:۔ آپ جیسے خیالات سب مردوں کے نہیں ہیں۔

اکرم :۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ حقوق اس لئے برابری کی حیثیت نہیں رکھتے کہ ہمارے ماحول نے عورت کو ایک چھوٹی موٹی کا پودا بنا رکھا ہے۔ نہ پڑھاتے ہیں نہ ملازمت کی ترغیب دیتے ہیں نہ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی سبق دیتے ہیں۔ اور عورت بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔

زاہدہ نے ایک لمبا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ جیسے خیالات سب ہی مردوں کے ہو جائیں تو پھر رونا کس بات کا ہے"۔

اتنے میں بوڑھی خادمہ نے چائے لا کر میز پر رکھ دی۔

چائے بڑی پر تکلف اور عمدہ تھی۔

اکرم نے چائے پی کر سینما چلنے کی دعوت دی۔ یہاں کسے انکار ہو سکتا تھا۔ یہ تینوں سینما پہنچ گئے بڑی دلچسپی سے سینما میں وقت گذرا۔ محبت سے فراق، انسانیت اور دوستی سب ہی عنوانوں تک بحث ہو گئی۔ اکرم اپنی کار میں ان لوگوں کو گھر چھوڑنے آیا نہ صرف چھوڑنے بلکہ کھانا بھی کھانے۔

کیوں کہ یہ طے پایا تھا کہ اکرم سینما سے واپس آ کر ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھائے گا۔

بوڑھی ملازمہ جس کو جامی کہتے تھے۔ اس خدمت پر مامور کر دی گئی تھی۔

جب یہ تینوں واپس گھر آئے تو دیکھا سارا گھر صاف تھا۔ سوائے مسہریوں کے اور صوفوں کے جملہ سامان گھر سے غائب تھا حتیٰ کہ سنگار میزیں بھی غائب تھیں۔ جب فیاض نے گھبرا کر سڑک پر ایک دُودھ والے کی دوکان سے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ بڑھیا تو ہمارے سامنے سب سامان تانگے پر لدوا کر لے گئی ہے اور جب ہم نے پوچھا تو اس نے کہا۔ کہ فیاض میاں نے مکان تبدیل کر لیا ہے۔ میں سامان لے کر جا رہی ہوں۔ وہ لوگ پہلے ہی نئے مکان میں جا چکے ہیں۔ جب فیاض نے زاہدہ کو بتایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کہنے لگی،

"بڑی بی نے ہم کو کہیں کا نہ رکھا۔ سب کچھ سمیٹ کر لے گئی"۔ اب کیا ہوگا۔ فیاض، زاہدہ نے کہا

اکرم نے کہا، تم پولیس میں رپورٹ کرو۔ مگر چوری کا بالکل غم نہ کریں۔ یہ نقصان میری وجہ سے ہوا اور میں ہی پورا کر دوں گا۔

زاہدہ نے فوراً کہا " نہیں نہیں خدا کی قسم آپ بالکل ذمہ دار نہیں ہیں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے "!

مگر اکرم نے مزید بحث کیے بغیر ان دونوں کو گاڑی میں بٹھا لیا اور تھانے پہنچ گیا۔ اکرم کے بہت سے پولیس والے واقف تھے۔ کیوں کہ وہ ایک باعزت تاجر اور رئیس آدمی تھا۔

پولیس والوں نے رپورٹ درج کرنے کے بعد فوراً تمام۔ تھانوں میں اطلاع کے لیے فون کر دیا،

اکرم دونوں کو واپس گھر لے آیا۔ اور ان سے صرف یہ کہا کہ یہ رات تو کسی طرح گذار لیں۔ انشاء اللہ کل سب بند و بست ہو جائیگا۔

اکرم رخصت ہو گیا اور دوسرے دن صبح ہی آ گیا۔ فیاض ابھی سو کر نہ اٹھا تھا اور زاہدہ اٹھ چکی تھی۔ اکرم نے کہا کہ فیاض کو سونے دیجئے اور میرے ساتھ چلیے۔

زاہدہ اس کے ساتھ چلی گئی اور تین چار گھنٹے بعد اپنے گئے ہوئے

سامان سے دگنا اور قیمتی سامان لے کر گھر آگئی۔

فیاض پریشان تھا کہ باجی بغیر مجھے اطلاع دیئے کہاں چلی گئی۔ ایک آدھ گھنٹے بعد خالی گھر پھر سج گیا۔

اکرم ایک عورت کو بھی لے آیا تھا۔ جو ملازمہ کے لئے مقرر کردی گئی۔

اکرم شادی شدہ تھا اور اس کے بچہ بھی تھا۔ مگر نجانے کیونکر وہ زاہدہ کی طرف بری طرح کھنچا جارہا تھا۔ حنیف پر وہ منظر بڑا سخت گذرتا جب وہ زاہدہ کی زبانی یہ سنتا کہ اکرم صاحب آئے تھے۔ اور فلاں چیز لائے تھے۔

تین چار روز بعد فیاض کی پہلی خادمہ جاجی پکڑی گئی اور سارا مال واپس مل گیا۔

اکرم نے مشورہ دیا کہ مکان دوسرا لے لیا جائے۔ لہٰذا کہنے کی دیر تھی کہ دوسرا بڑا مکان لے لیا گیا۔ اکرم نے اس مکان کو پانچ سال کا پیشگی کرایہ ادا کردینے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچکر چھ ہزار میں زاہدہ کے نام خرید لیا۔

ابتک ان تمام باتوں کے باوجود اکرم کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ اظہار محبت کرسکے۔ حالاں کہ گھنٹوں تخلیہ میں بیٹھے۔ اور باتیں کرنے کا موقع ملتا تھا۔ مگر دونوں ایک ایسے تکلف میں رہتے کہ کچھ مطلب کی بات زبان پر نہ آتی۔

زاہدہ اب اس منزل پر تھی جہاں محبت جتانا گھاٹے اور نقصان کی صورت ہوتی ہے۔

لہٰذا وہ یہ چاہتی تھی کہ اکرم کو خود ہی محبت جتانے کا موقع دے اور اپنی طرف سے پہل نہ کرے۔ اور اکرم اس قدر خود دار تھا کہ اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

اس نے کبھی کسی بازاری عورت سے راہ و رسم نہ رکھی تھی۔ اور لوگوں کا یہ کہنا درست تھا کہ اکرم ایک نیک اور اچھے چال چلن کا انسان ہے۔ مگر یہ وقت کی بات ہے۔ کہ وہ زاہدہ پر بُری طرح مرمٹا۔

فیاض نے منیجر کی حیثیت سے کام سنبھال لیا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دینے لگا تھا۔

حنیف نے نئے مکان میں آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ زاہدہ کو حنیف سے تھوڑی یا بہت ظاہری یا دلی محبت تھی۔

اکرم سے گاڑھی چھن جانے کے باوجود کبھی کبھی اس سے کہیں نہ کہیں ملتی رہتی یا گھر پر بلا لیتی تھی۔

اب اکرم سے راہ و رسم ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ مگر اکرم زبان پر دل کی بات نہ لا سکا تھا۔ اکثر رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک زاہدہ کے پاس بیٹھا رہتا مگر کچھ کہہ نہ سکتا۔

ادھر اکرم کی بیوی پریشان تھی کہ کیا بات ہے کہ اکرم گھر دیر سے آتا ہے۔ اور پہلا سا التفات بھی نہیں ہے۔

ادھر حنیف کے دوستوں نے اسے بھڑکانا شروع کیا اور کہا۔

"واہ حنیف تم نے اپنی زندگی اس لڑکی کے پیچھے تباہ کردی اور گھر کی نظروں میں بھی گر گئے۔ سارا مال بھی اس کی نذر کردیا۔ بازار کے بھی قرض دار ہو گئے۔ اور پھر بھی وہ اکرم کا پہلو سجارہی ہے۔ آخر تم خاموشی سے یہ سب کچھ کیسے اور کیوں دیکھ رہے ہو!"

حنیف نے بھی سوچا کہ واقعی دوست ٹھیک کہتے ہیں۔ وہی۔ زاہدہ جو کل میرے بغیر کھانا نہ کھاتی تھی آج اکرم کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتی۔ میں زاہدہ سے فیصلہ کردوں گا۔

یہ سوچکر وہ زاہدہ کے پاس آیا اتفاق سے اکرم بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مگر حنیف نے پرواہ نہ کی اور زاہدہ کو دوسرے کمرے میں بلالیا اور کہا۔

"زاہدہ تم جانتی ہو کہ جو کچھ کررہی ہو اس کا انجام کیا ہوگا"

زاہدہ :۔ میں تو کچھ بھی نہیں کررہی جو انجام سے ڈروں۔

حنیف :۔ تو پھر یہ اکرم سے راہ ورسم کیسے ہیں۔

زاہدہ :۔ حنیف تم قسم لے لو کہ اگر اکرم سے کوئی بھی میرا غیر شریفانہ یا برا تعلق ہو۔

حنیف :۔ تو پھر وہ ہر وقت تمہارے گھر میں کیوں رہتا ہے۔ اس نے فیاض کو اپنے یہاں ملازم کیوں رکھا ہے تم اس کے ساتھ کیوں گھومتی ہو

زاہدہ :۔ بات یہ ہے کہ ان کے احسانات بھی ہم پر کچھ کم نہیں

ہیں۔ یہ گھر انھوں نے میرے ہی نام خرید کر دیا ہے۔ فیاض کو اچھی ملازمت دی۔ یہ سب کچھ انھوں نے صرف اس لئے کیا کہ تمہاری حالت سدھر جائے اگر میں ان کے ساتھ برا سلوک کروں اور آنے جانے پر پابندی لگا دوں یا کہیں ان کے ساتھ نہ جاؤں تو تم ہی سوچو کہ ان پر کیا گذرے گی۔

میں تمہاری بھی اسی طرح آج تک ممنون ہوں جس طرح پہلے تھی اسی طرح ان کی بھی احسان مند ہوں۔

حنیف :۔ ہاں! تو یوں کہو کہ جو تمہارے لیئے دولت کا منہ کھولے وہ تمہارا ہے اگر اکرم کا تم سے کوئی مطلب وابستہ نہیں ہے۔ تو یہ سب کچھ اس نے کیوں کیا ہے۔ شہر میں اور بھی بہت سے غریب اور محتاج پڑے ہیں اگر اکرم ایسا ہے غریب پرور ہے تو وہ کیوں نہیں ان غریبوں پر توجہ کرتا۔ وہ تمہارے لیئے ہی کیوں سب کچھ کرتا ہے۔ دیکھو زاہدہ مجھے بیوقوف نہ بناؤ۔ میرے پاس جو کچھ تھا۔ وہ میں تمہاری بھینٹ کر چکا ہوں۔ اور اب میں تمہیں کسی اور کے پہلو میں بیٹھے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں کوئی فیصلہ ضرور کرنا ہوگا۔

زاہدہ :۔ حنیف تم اس قدر جذباتی نہ بنو۔ غصہ سے کیا حاصل جب میں کہہ چکی ہوں کہ اکرم سے میرا کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ جس سے تمہیں تکلیف کا احتمال ہو۔ تو پھر کیوں تم ایسی باتیں کر رہے ہو تم میرے لئے وہی حنیف آج بھی ہو جو کل تھے۔

حنیف :۔ مگر اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں تم ایک میان میں

دو تلوارین نہیں رکھ سکتیں۔ اگر اب تک اکرم سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے تو کل ضرور ہو جائے گا۔ میں نے زمانہ دیکھا ہے میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔

زاھدہ :۔ تو آخر تم چاہتے کیا ہو؟

حنیف :۔ بس یہی کہ تم اکرم سے راہ و رسم ختم کر دو اور وہ تمہارے پاس نہ آیا کرے۔

زاھدہ :۔ اگر میں کہوں کہ یہ بات ناممکن ہے۔

حنیف :۔ تم میں یہ ہمت نہیں کہ کہہ سکو۔ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔

زاھدہ :۔ حنیف میں پھر کہتی ہوں کہ تم غصہ کو چھوڑ دو۔ تمہیں اس غصہ کا کوئی حق نہیں۔

حنیف :۔ حق کیوں نہیں ہے۔ میری دولت تمہارے خون کے ہر قطرے میں نظر آئے گی۔

زاھدہ :۔ تو حنیف سن لو کہ تم اپنی دولت کے عوض بہت حاصل کر چکے ہو اب تک میں تمہاری احسانمند تھی۔ مگر اب نہیں ہوں۔ تم ضد کرتے ہو تو کہتی ہوں کہ تم نے بھی اپنا پیسہ مقصد کے تحت خرچ کیا تھا اور وہ مقصد تم پا چکے ہو۔ میرا تمہارا حساب صاف ہے۔

حنیف :۔ اچھا تو تو اس قدر کمینہ پن پر اتر آئی ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ میں طوائف ہوں۔ مجھے پیسے سے محبت ہے انسان سے نہیں۔

زاھدہ :۔ تم جو کچھ چاہو کہہ لو۔ مگر یاد رکھو کہ یہ الفاظ بھی محض تمہارے بے تکے جملوں کے جواب میں کہے ہیں۔

حنیف :۔ میں خوب سمجھتا ہوں زاہدہ! یہ تم نہیں بول رہی ہو اکرم کا پیسہ بول رہا ہے مگر یاد رکھو کہ مجبور انسان جو محبت سے محروم کر دیا گیا ہو۔ سب کچھ کر گذرتا ہے۔

زاھدہ :۔ مگر میں نے تمہیں اپنی محبت سے محروم نہیں کیا۔ تم نے آنا جانا خود کم کر دیا تھا اور میں تم کو اکثر بلوایا کرتی تھی۔ صرف تجدید محبت کے لئے۔ میں نے تم کو کتنی دفعہ بلوایا ہے اور اسی محبت سے برتاؤ کیا ہے جو پہلے کرتی تھی۔ اگر میں اکرم کی آمد سے بدل جاتی تو تم کو کیوں بلاتی۔

حنیف :۔ یہ تو ایک طوائف کے ہتھکنڈے ہیں۔ جو تم نے خوب سیکھ لئے ہیں۔

زاھدہ :۔ (غصہ سے) بس حنیف اب ایک لفظ منہ سے نہ نکلے۔ میں سب کچھ سن سکتی ہوں مگر اپنی محبت کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے پاس اس سے بڑا ثبوت نہ تھا۔ تم اسے بھی فریب تعبیر کر رہے ہو۔ تو سن لو آج سے زاہدہ تمہارے لئے مر چکی ہے اگر اس سے ملنے کی کوشش کرو گے۔ تو ایسی روحیں پیچھے پڑ جائیں گی کہ تم کو ان سے دامن چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

حنیف :۔ میں روح تو کیا اس سے بھی بڑی چیز کو قابو میں

کر لینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو تم کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

زاہدہ :۔ کہاں ؟

حنیف :۔ جہاں میں لے جاؤں۔

زاہدہ :۔ میں مجبور ہوں۔

حنیف :۔ تمہیں چلنا ہوگا۔

زاہدہ :۔ میں نہیں جا سکتی۔

ان دونوں کی گفتگو کافی تیز ہو چکی تھی اور اب اکرم بھی ان کی تلخ و ترش باتوں کو سن رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھا تاکہ کسی نامناسب واقعہ کو ظہور پذیر نہ ہونے دے۔ اور وہ اس کمرے میں آگیا۔ جہاں دونوں باتیں کر رہے تھے۔

دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ اکرم نے ذرا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" معاف کیجئے گا۔ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں حائل ہو گیا ہوں "۔

حنیف :۔ جی ہاں حضور یہ لہجے کی ترشی صرف آپ کے ظہور ہی کی بدولت ہے۔ قبلہ۔

زاہدہ :۔ حنیف تم اکرم سے چھیڑ خانی نہ کرو۔ غصہ کو تھوک دو۔ اور اب ذرا گھر جا کر ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ جو کچھ تم نے کہا وہ نہیں کہنا چاہیے تھا یا نہیں ......

حنیف:۔ مکار، بازاری عورت آگ لگا کر ٹھنڈا کرتی ہے۔

"حنیف کا یہ کہنا تھا کہ اکرم نے بڑھکر دو تھپڑ رسید کئے اور دونوں میں باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی۔ اکرم طاقتور تھا اس نے حنیف کو نیچے گرالیا اور اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا"

زاہدہ رونے لگی اور بولی۔

"اکرم رہنے دو اللہ کے واسطے ان کو چھوڑ دو۔ انھیں غصہ آگیا تھا جو اتر جائے گا۔

اکرم نے اسے چھوڑ دیا اور حنیف خون کا گھونٹ پی کر کمرے سے نکل گیا۔ اکرم نے معاملہ پوچھا تو زاہدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آخر اکرم نے مناسب سمجھا کہ مرے مردے نہ اکھیڑے جائیں اور زاہدہ کو تسلی دیتا رہا۔

آج پہلی مرتبہ اس نے زاہدہ کے آنسو اپنے رومال سے پونچھے تھے جب زاہدہ خاموش ہوکر بیٹھ گئی۔ تو اکرم نے کہا۔

"زاہدہ تم بڑی کمزور ہو۔ ذراسی بات پر رونے لگیں"۔

زاهدہ:۔ کیوں نہ روؤں میری قسمت ہی ایسی ہے جن لوگوں کو ذراسا منہ چڑھا تو وہی مجھے بازاری عورت کہہ جائیں۔ میں اب یہاں نہیں رہونگی۔ جہاں جی چاہے گا چلی جاؤں گی۔

اکرم:۔ یہ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو ارے لوگوں کی زبان کون روک سکتا ہے وہ تو بادشاہ کو بھی برا کہہ سکتے ہیں۔

زاہدہ :- مگر تجھے، اور حنیف نے تو میرے منہ پر سب کچھ کہا ہے، ایک بے سہارا لڑکی کو دنیا سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ اور لڑکی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اکرم :- یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

زاہدہ :- ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔

اکرم :- زاہدہ اگر تم کہو تو اس کی بتیسی باہر نکال دوں۔ اس کا جبڑا توڑ دوں، تم نے ہی تو چھڑا دیا تھا ورنہ میں تو عقل ٹھکانے لگا دیتا۔

زاہدہ :- مارنے پیٹنے سے کیا ہوتا ہے میں تو اس شہر میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میں تو یہاں سے چلی ہی جاؤں گی۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ دنیا مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھے۔

اکرم :- آخر تم کہاں جاؤ گی۔

زاہدہ :- جہاں بھی سینگ سمائیں گے۔

اکرم :- اگر تم اس ضد پر اڑی ہو کہ کہیں جانا چاہتی ہو تو یاد رکھو کہ تمہارے بغیر اکرم کی زندگی بیکار ہو جائے گی۔

زاہدہ :- میں تو تمہیں ساتھ لیجانا نہیں چاہتی اور نہ مجبور کر رہی ہوں، میں تو فیاض تک کو ساتھ نہ لے جاؤں گی۔

اکرم :- زاہدہ! تو پھر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔؟

زاہدہ :- بس ارادہ یہ ہے کہ کہیں جا کر خود کشی کر لوں گی۔ اگر یہاں مروں گی تو بہت بدنامی ہو گی۔

اکرم :۔ زاہدہ دیکھو ان خیالوں کو دل سے نکال دو۔ مجھے ایسے الفاظ سن کر بڑی تکلیف ہوتی ہے تم نہیں جانتی کہ میں تم سے کس قدر قریب ہو گیا ہوں۔

زاہدہ :۔ اکرم! یہ قربت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج حنیف کو اتنا کہنے کی جرأت ہو گئی۔

اکرم :۔ آدمی آدمی کا پہچاننا بھی ضروری ہے۔ جس کا ظرف اتھلا ہو اسے اہمیت نہ دی جائے تو اچھا ہے۔

زاہدہ :۔ اگر مجھ میں ظرف پرکھنے کی صلاحیت ہوتی تو پھر کہنا ہی کیا تھا۔

اکرم :۔ اچھا! ایک بات پوچھنے کی ہمت کر رہا ہوں اگر اجازت ہو.....

زاہدہ :۔ پوچھئے۔

اکرم :۔ میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

زاہدہ :۔ میرے رویہ سے ظاہر ہے کہنے کی ضرورت نہیں ہے

اکرم :۔ مگر تمہارا رویہ میرے لئے آج تک معمہ بنا ہوا ہے۔

زاہدہ :۔ وہ کیسے۔

اکرم :۔ بس یہ ہی کہ میں اس گھر میں اپنی حیثیت سمجھتا ہوں۔

زاہدہ :۔ آپکی حیثیت اس گھر میں؟ یہ تو گھر ہی آپکا ہے۔

اکرم :۔ تو پھر میں کون ہوں؟

زاھدہ :۔ گھر والے۔

اکرم :۔ اور تم۔

زاھدہ :۔ کچھ بھی نہیں۔

اکرم :۔ نہیں زاہدہ کہہ دو، کہہ دو کہ تم کیا ہوئیں۔

زاھدہ :۔ آپ مجبور کرتے ہیں تو میں کہے دیتی ہوں کہ میں پھر گھر والی ہوئی۔

اکرم :۔ مسکراتے ہوئے تو پھر ہم دونوں کیا ہوئے؟

زاھدہ :۔ شرما گئی اور اکرم بضد ہو گیا کہ بتاؤ۔ آخر زاہدہ کو کہنا پڑا کہ "دہی جو آپ کہلوانا چاہتے ہیں"

اکرم :۔ "تو میں آج سے زاہدہ کو اپنی امانت سمجھوں"؟

زاہدہ نے شرما کر گردن جھکا لی اور کہہ دیا۔

"آپ کو اختیار ہے"۔

اکرم یہ جملہ سن کر اس قدر خوش ہوا کہ جیسے اسے ساری کائنات کی رنگینیاں مل گئی ہوں۔ وہ سب کچھ پا گیا ہو اور اس کی مراد مل گئی ہو۔

اکرم اور زاہدہ کے رومانی تعلقات کا افتتاح ہو چکا تھا اور حنیف انتقام کی آگ سینے میں دبائے پھر رہا تھا۔ حنیف کو اس کے رقیب نے مارا تھا۔ یہ بات اور بھی اس کے لئے ناسور بن گئی تھی۔

حنیف اسی دن لاہور روانہ ہو گیا تھا تاکہ وہ زاہدہ کے شوہر سے ملے۔ حنیف کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ بالآخر جاوید تک پہنچ ہی گیا۔ دراصل جاوید نے اپنا نام بدل دیا تھا۔ اور وہ اب شہر میں سیٹھ جواد کے نام سے مشہور تھا۔

اس کی حالت بدل چکی تھی مسلسل دو سال ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس قابل ہوا تھا کہ اپنے کو کسی قابل کہہ سکے۔ وہ شراب کا عادی ہو چکا تھا اور کوٹھوں پر جاکر بازاری عورتوں سے دلچسپی لینا اس کی زندگی کا اہم جز بن چکا تھا۔

حنیف کا جاوید سے براہِ راست اور بلا وجہ ملنا مناسب نہ تھا اس لئے اس نے اپنے آپ کو لونگ اور کالی مرچ کا امپورٹر ظاہر کیا اور

اور اس طرح وہ چند ہی دن میں اس سے گھل مل گیا۔ ان دو چار دنوں میں تمام خرچہ حنیف نے کیا۔

جاوید اس خرچیلے نوجوان سے بہت متاثر ہوا اور اسے کئی دن تک اپنے ہاں مہمان رکھا۔

حنیف نے چلتے وقت کہا کہ ہم نے آپکا شہر تو گھوم لیا۔ اب آپ بھی دو چار روز کے لئے ہمارے ہاں آئیے۔

جاوید:۔ ہاں دیکھئے عجیب بات ہے کہ چھ روز ہو گئے اب تک میں نے یہ ہی معلوم نہیں کیا کہ آپکا مستقل قیام کس شہر میں ہے۔

حنیف:۔ اجی یہ دن ہی ایسے گذرے کہ ذکر کی نوبت ہی نہ آئی بہر حال کچھ بھی ہو آپکو آنا ضرور پڑے گا۔

جاوید:۔ میں ضرور آؤں گا مگر اپنا کچھ پتہ بھی تو بتائیے ورنہ کہاں جاؤں گا۔ اور کہاں ٹھہروں گا۔

حنیف: بس آپ راولپنڈی کے کھنڈری بازار۔۔۔۔

جاوید:۔ جی راولپنڈی؟

حنیف:۔ جی ہاں! جی ہاں۔ مگر آپ کو اس قدر حیرت کیوں ہوئی؟

جاوید:۔ یار میں کیا بتاؤں۔ میری زندگی کی تمام تلخیاں اسی علاقہ سے وابستہ ہیں۔

حنیف:۔ اگر آپ تصنع نہ سمجھیں تو ایک بات عرض کردوں

جاوید:۔ ہاں ہاں کہئے۔

حنیف:۔ میں نے پہلی ملاقات سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ آپ شراب کی تلخی میں زندگی کی کسی تلخی کو گھول کر پی جانا چاہتے ہو۔

جاوید: بس یہی بات ہے

حنیف:۔ اگر آپ کو مجھ پر کچھ بھی بھروسہ ہے اور میں کسی کام آسکتا ہوں تو مجھے خدمت کا اور اعتماد کا موقع دیجئے۔

جاوید:۔ دوست مجھے تم پر اعتماد ہے۔

حنیف:۔ اگر اعتماد ہے تو پھر مجھے بھی شریک حال بناؤ"

جاوید:۔ کیا سنو گے تم میرے دوست یہ راز آج تک سینے میں ہے جب اوپر کو سانس لیتا ہوں تو سینے کے داغ دکھتے معلوم ہوتے ہیں۔

حنیف:۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ راز کا چرچا نہ کرنا چاہئے مگر اپنے شفقوں سے چھپانا بھی اچھا نہیں۔ ممکن ہو میں کچھ مدد کر سکوں۔

جاوید:۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے مشفق ہو مگر کیا کروں اس راز کے انکشاف سے میرا دل دکھتا ہے۔

حنیف:۔ شاید مجھ پر بھروسہ نہیں اگر ایسا ہے تو پھر میں زور نہیں دیتا۔

جاوید:۔ نہیں حنیف تم دل شکستہ نہ کرو۔ میں سناتا ہوں

حنیف :- مجھے اپنے اوپر رشک ہونے لگا ہے۔

جاوید :- لو سنو۔ آج تقریباً ڈھائی سال بعد صرف تم ہی کو یہ راز بتا رہا ہوں۔ ورنہ کسی کو یہ بھی نہیں بتایا کہ لاہور سے پہلے میں کہاں رہتا تھا۔ سنو دوست میں بھی راولپنڈی کا رہنے والا ہوں۔

میں میٹرک میں پڑھتا تھا کہ مجھے اپنے پڑوسی کی لڑکی زاہدہ سے محبت ہو گئی۔ اتفاق سے زاہدہ کے والد بیمار ہو گئے۔ اور ان کے علاج وغیرہ کے سلسلے میں میں نے ان لوگوں کی بہت مدد کی اور امکان سے باہر مدد کی۔ زاہدہ کی والدہ فرزانہ بھی تقریباً جوان ہی تھی۔

بہرحال سارا قصہ یہ ہے کہ میں نے اپنا گھر چھوڑ کر زاہدہ سے شادی کر لی اور فرزانہ کے ساتھ رہنے لگا۔ میں والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ جب فرزانہ نے شادی کر لی تو ہم لوگ اپنے گھر چلے آئے۔

اتفاقات ایسے ہوئے کہ فرزانہ کو ایک ہی رات کے بعد شوہر سے ایسی تلخیاں ملیں کہ کچھ دن بعد ہی طلاق لینی پڑی۔ اس طلاق سے میری ساس (یعنی فرزانہ) دل برداشتہ ہو گئیں مگر کچھ عرصے کے بعد انہیں شراب کی عادت کے علاوہ ایک نوجوان منیر نامی سے محبت ہو گئی۔ اور جب ان کا انتقال ہوا تو وہ سارے شہر میں ایک پیشہ ور عورت مشہور ہو چکی تھی۔

اس کے علاوہ جو نوجوان میری ساس کا منظور نظر تھا وہی میرے گھر رہنے لگا۔ میں نے اسے اجازت اس لئے دی تھی کہ میں ان باتوں

سے بے خبر تھا۔

اس لڑکے نے میری بیوی زاہدہ سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے اور ایک دن میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں حدود سے باہر دیکھا۔ مجھے بہت سخت صدمہ پہنچا۔ اور اسی دن میں نے شراب پینی اور بازارِ حسن کی سیر کرنی شروع کر دی۔

مگر اپنی بیوی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اسے کس رنگ میں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے اس کی طرف توجہ کم کر دی کیونکہ بد دل ہو چکا تھا۔ میں نے تمام اثاثہ عیاشی میں اڑانا شروع کر دیا اور زاہدہ کو حمل قرار پا گیا تھا جو یقیناً ناجائز تھا۔ تو میں نے اس شہر ہی سے منہ موڑ لیا اور ایک پائی لیکر لاہور چلا آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا کہ وہ فاقے کرے مگر اب کی مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا یا کیا نہیں۔ وہ زندہ ہے یا مر گئی اور اب تک اسی غم کو بھولنے کے لیے شراب پیتا ہوں اور بازارِ حسن کی سیر کرتا ہوں۔

میرے دوست اس بیوی کی نیکیاں اور وفاداریاں کیا بتاؤں مگر باوجود اس کے وہ بہک گئی۔ اور میں نے اسے منجدھار میں چھوڑ دیا۔

حنیف:۔ اُف وہ کس قدر دردناک ہے تمہاری داستان مگر اب تو میرے خیال میں آپ کو راولپنڈی چل کر ٹھہرنے میں جھجک نہ ہونی چاہیئے بلکہ اگر وہاں جائیں گے تو یہ نقوشِ غم کچھ ہلکے ہی پڑ جائیں گے۔

جاوید :۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ بلاؤ یا نہ بلاؤ۔

حنیف :۔ نہیں جناب میں تو ضرور مدعو کروں گا اور جب دیکھوں گا کہ راولپنڈی میں آپ کی آمد ضروری ہے اور بازار میں اچھی گانے والیاں آگئی ہیں تو ضرور میں خط لکھوں گا۔

جاوید :۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے نہ ہی بلاؤ تو اچھا ہے۔

حنیف :۔ نہیں صاحب آپ کو ضرور آنا ہو گا۔

جاوید :۔ اچھا تمھاری مرضی۔

اس کے بعد حنیف واپس راولپنڈی آگیا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

یہاں اکرم اور زاہدہ کی گاڑھی چھن رہی تھی۔ اب زاہدہ نے بھی سوچ لیا تھا کہ حسن کے دام وصول کر دوں اسی نظریہ کے تحت اس نے فرمائشوں کا اکرم کو بدحال کر رکھا تھا۔

ادھر حنیف بھی انتقام کی فکر میں تھا اس نے پہلے تو جاوید سے ملاقات کی تھی اور پھر ایک حسین لڑکی کو جو ایک مشہور طوائف کی صاحبزادی تھی اکرم کے پیچھے لگا دیا تھا

یہ لڑکی نیلوفر برقعہ میں اکثر اکرام سے ملتی مگر اس انداز سے کہ سوائے اتفاق کے اس پر کچھ ظاہر نہ ہو۔ نیلوفر نے اپنا پورا چہرہ کبھی نہ دکھایا تھا۔ چار پانچ روز بعد وہ اکرم کے اسٹور پہنچی اس وقت اکرم بیٹھا ہوا تھا۔ نیلوفر نے نقاب اٹھا دیا اور اکرم پر بجلی

گر پڑی۔ وہ چند منٹ تک نیلوفر کو دیکھتا رہا۔ اور اس کے بعد نیلوفر نے کچھ ایسی چیزیں خریدیں کہ جن سے اکرم کو اور بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور جب نیلوفر نے بل مانگا تو اکرم نے کہا،

"کوئی بات نہیں مہینے پر حساب ہو جایا کرے گا آپ یہیں سے ضروریات کی چیزیں خریدا کریں"۔

نیلوفر بڑی ہوشیار تھی اس نے فوراً سو روپے کا نوٹ نکالتے ہوئے اکرم کو دیا اور کہا،

"یہ میرے حساب میں جمع کر لیجئے اب میں یہیں سے مال خریدا کروں گی"۔

اکرم نے لاجواب ہو کر نوٹ لے لیا۔ اب نیلوفر کے لئے زیادہ اچھا موقع تھا کہ وہ اکرم سے روزانہ مل سکے اور یہی ہوا، نتیجے کے طور پر اکرم کو نیلوفر سے محبت ہو گئی، اور وہ ہر قیمت پر نیلوفر کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا،

جب وہ نیلوفر کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا تو زاہدہ کو بھی علم ہو گیا اور وہ اکرم کے آڑے آئی۔

پہلے تو اکرم نے نرمی سے سمجھایا کہ وہ اس معاملے میں نہ آئے مگر زاہدہ کیسے خاموش رہ سکتی تھی اس کی آمدنی اور فرمائشیں بند ہو رہی تھیں، اس نے اکرم پر زور دیا کہ وہ اس لڑکی سے نہ ملے مگر جب اکرم نے دلیری سے زاہدہ کی اس درخواست کو ٹھکرا دیا تو وہ حیرت زدہ ہو گئی

ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکرم نے فیاض کو نوکری سے علیحدہ کر دیا۔

اس کے علاوہ زاہدہ کے ہاں جو قیمتی سامان تھا وہ بھی اکرم نے زبردستی واپس لے لیا۔ مکان زاہدہ کے نام تھا مگر وہ بھی زاہدہ کو مجبوراً اکرم کے نام منتقل کرنا پڑا۔ مختلف بہانے کر کے اکرم نے وہ رقم بھی زاہدہ سے وصول کر لی جو اس نے جمع کر رکھی تھی اور جب زاہدہ بالکل قلاش ہو گئی تو اکرم نے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ چند دن بعد اکرم نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا اور زاہدہ کو دوبارہ اس چھوٹے سے مکان میں آجانا پڑا۔ جہاں سے وہ اکرم کے کہنے پر منتقل ہوئی تھی۔ تھوڑا بہت گھریلو سامان تو موجود ہی تھا۔ مگر وہ بھی رفتہ رفتہ فروخت ہونے لگا۔ آخر پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔ فیاض بھی خاموش پڑا رہتا۔ اور ملازمت کی تلاش نہ کرتا۔

فیاض اپنی بہن کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ اور اس کا ضمیر بار بار ملامت کر رہا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا کیونکہ اس کی بہن کا ضمیر تو ملامت نہ کرتا تھا۔ بلکہ اس کی بہن تو دنیا میں سب سے اچھا پیشہ ہی اسے سمجھ چکی تھی۔ ایک دن گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا اور کوئی ایسا سامان بھی نہ رہا تھا جسے فروخت کر کے روٹی کا سلسلہ کیا جاتا وہ ایک بجے تک بھوکی بیٹھی رہی فیاض بھی خاموش چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ زاہدہ کسی خیال کے تحت اٹھی برقعہ پہنا اور باہر نکل گئی ایک گھنٹہ بعد

وہ واپس لوٹی تو اس کے ساتھ ایک نووارد بھی تھا یہ دونوں اندر کمرے میں جا بیٹھے۔ فیاض نے ان دونوں کو ایک نظر سے دیکھا اور پھر گردن جھکا کر لیٹ گیا زاہدہ نے آواز دی فیاض تم بازار سے کھانا لے آؤ اور فیاض دس روپے کا نوٹ بہن سے لے کر بازار چلا گیا اور جب وہ گھنٹہ بعد کھانا لے کر گھر آیا تو نووارد جا چکا تھا۔

زاہدہ خوش تھی کہ پچاس روپے بیٹھے بٹھائے کما لئے مگر فیاض کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا وہ ہرگز بہن کی اس حرکت کو پسند نہ کرتا تھا ایک دن مجبور ہو کر اس نے کہہ ہی دیا۔

"باجی اگر تم اجازت دو تو میں کہیں باہر جا کر ملازمت کر لوں"

زاہدہ :۔ کیا تمہیں روٹی نہیں ملتی جو ملازمت کرو گے اور وہ بھی باہر جا کر کیا یہاں نوکری نہیں ملتی۔

فیاض :۔ نہیں باجی میں اس شہر میں تنگ آ چکا ہوں اور میرا ایک لمحہ بھی یہاں جی نہیں لگتا۔

زاہدہ :۔ ہرگز نہیں تم میرے دم کے ساتھ ہو گے میں کبھی تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

فیاض :۔ میں سمجھتا ہوں باجی کہ تم اکیلی بھی یہاں رہو گی تو کوئی تکلیف نہ ہو گی میں جاتے ہی تمہیں روپے بھیج دوں گا۔

زاہدہ :۔ مجھے تمہارے روپے کی ضرورت نہیں ہے ایک مرتبہ کہہ جو دیا کہ میں نہیں جانے دوں گی ایک تمہارا ہی سہارا اس

دنیا میں باقی رہ گیا ہے اور تم بھی مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔

فیاض :۔ مگر باجی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔

زاھدہ :۔ کہو منع کس نے کیا ہے۔

فیاض :۔ بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری حرکتیں پسند نہیں ہیں اس سے تو اچھا ہے کہ تم کسی سے نکاح کر لو۔

زاھدہ :۔ ہوں نکاح کر لو حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ مگر فیاض تمہیں پتہ ہے کہ ہم کون تھے اور اب زمانے نے ہمیں کیا کر دیا، ہم بھوکے مرتے تھے بچے۔ کسی نے ہمدردی سے ایک بات بھی نہ کی۔ مگر جب زمانے کی فطرت کو سمجھ لیا تو سارے سر ہمارے سامنے جھک گئے۔ تم کہتے ہو کہ نکاح کر لو مگر وہ کس طرح تمہارے دولہا بھائی جب سے مجھے چھوڑ کر گئے ہیں آج تک کوئی خبر لی ان کا کوئی پتہ چلا۔ جب تک وہ طلاق نہ دیں میں نکاح کیسے کر سکتی ہوں۔ اور جب وہ مجھے مجبور کرنا چاہتے ہیں تو میں بھی اس کا علاج جانتی ہوں اور وہ یہی ہے جو آج تک کرتی رہی ہوں تم خود سوچو کہ شوہر کو نان نفقے کی نہ تو فکر ہے اور نہ طلاق ہی دینا چاہتا ہے۔ نہ میرے پاس کوئی جائیداد تھی اور نہ کوئی زیور جو زندگی کے دن عزت سے گذار سکتی اگر میں انتقاماً یہ رویہ اختیار نہ کرتی تو بتاؤ کیا کرتی۔

فیاض :۔ مگر زندگی تو اس وقت بھی عزت سے گذر رہی تھی جب آپ ڈپٹی صاحب کے ہاں کام کرتی تھیں اور میں ڈاکٹر صاحب کے

پاس تیس روپے میں ملازم تھا۔

زاهده: ۔ اور اس کا انجام تم نے نہیں دیکھا۔ میں وہاں زندگی گذار دیتی اپنی ہڈیاں سرمہ بنا دیتی مگر ہوس کے کتوں نے وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا اور ایک عزت دار بے کس لڑکی کو پولیس کی حراست تک میں دیدیا۔

فیاض: ۔ اچھا باجی! کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ملازمت کر دوں اور تم ایک مرتبہ پھر عزت دار زندگی گذارنے لگو۔

زاهده: ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر میرا تجربہ بتا رہا ہے کہ اس دنیا میں کوئی لڑکی باعزت رہنا بھی چاہے گی تو زمانہ دس فتنے اٹھا کر اسے گمراہ کر دے گا۔ اور میں اب زمانے کو یہ موقع دینا ہی نہیں چاہتی۔

فیاض بہن کی باتیں سن کر خاموش تو ہو گیا تھا، مگر ان باتوں سے وہ مطمئن نہ تھا۔ وہ اس گھناؤنے ماحول سے نکل ہی جانا چاہتا تھا۔

دو چار روز تو اس نے شہر میں ادھر ادھر گھومنے اور روپے فراہم کرنے میں گذار دیئے، اور پانچویں روز رات کو وہ اپنی بہن کو اس کے گندے ماحول کے ساتھ چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ اس نے ایک مفصل خط اپنی بہن کے نام لکھا اور اس کی سنگار میز پر رکھ دیا۔

صبح کو جب زاہدہ سو کر اٹھی، منہ ہاتھ دھویا اور بستر تہہ کرنے آئی تو سنگار میز پر خط پڑا دیکھا، وہ پہلے ہی فیاض کو نہ پا کر کچھ حیران سی تھی خط نے تو اس کے بالکل ہی اوسان خطا کر دیئے،

ہاتھ پاؤں لرزنے لگے، اس نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھول کر پڑھا۔

"پیاری باجی" سلام مسنون

میں بہت مجبور ہو کر آج تم سے جدا ہو رہا ہوں، ارادہ تو یہ

ہے کہ کبھی نہ ملوں مگر حادثات زمانہ ملا دیں تو محض یہ ایک اتفاق ہو گا۔

باجی میری اچھی باجی میں تمہیں چھوڑ کر جو درد محسوس کر رہا ہوں وہی درد یقیناً تم بھی محسوس کرو گی۔ بہن بھائی کا رشتہ خون کا رشتہ ہے۔ جو ہر حالت میں برقرار رہتا ہے نہ جانے میں یہ جدائی کا غم برداشت بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ تم نہ صرف میری بہن ہو بلکہ میری ماں بھی ہو۔ تم نے ہی مجھے پالا پوسا ہے۔ بڑا کیا ہے۔ شعور بخشا ہے۔ مگر اُف باجی اگر تم یہ شعور نہ بخشتیں تو اچھا تھا۔ لاشعوری میں تو انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر باشعور ہو جانے کے بعد وہ اپنے ضمیر کا تابع فرمان ہوتا ہے ضمیر کی آواز کو رہنما سمجھتا ہے۔ تم نے نیک اور پارسا زندگی کو گھناؤنے تاریک اور گندے ماحول کے سپرد کر دیا ہے۔ جس کے تعفن سے میرا دماغ پھٹا جاتا ہے۔ چونکہ میں اس تعفن کو برداشت نہ کر سکا اور گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ باجی جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جاوید بھیا بھی تم کو اسی لئے چھوڑ کر چل دیئے کہ تم نے ایک آوارہ نوجوان کو بہت سر چڑھا لیا تھا۔ اور شاید وہ تم دونوں کے راز سے واقف ہو چکے تھے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ

جاوید بھیا ایسے ہیں تھے۔

انھوں نے ہماری اس وقت مدد کی تھی۔ جب کہ وہ خود مجبور تھے۔ تم نے ان کی کسی قربانی پر توجہ نہ دی، اور ان کی محبت کی قدر نہ کی، وہ بھی مجبور ہو گئے۔ اور ہمیں تمہارے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ انہیں تمہاری اس حرکت پر رنج نہ ہوا ہوگا۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ رنج ان کی زندگی کا ناسور بن گیا ہوگا۔

بہرحال زندگی تمہاری ہے۔ تم چاہو تو اسے رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، ملکہ مہرالنساء اور خالدہ ادیب خانم کی طرح گذار دو، اور چاہے زہرہ بائی، نواب جان اور چھپن چھری کی طرح گذار دو، مگر یاد رکھو کہ تاریخ رضیہ سلطانہ وغیرہ کے نام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جبکہ زہرہ اور چھپن چھری کا کوئی نام لیوا تک نہیں ہے۔

تم نے زندگی کی کئی تلخیاں اپنے ذاتی اعمالوں سے خریدیں۔ قدرت نے تمہیں کئی مرتبہ سنبھلنے کا موقع دیا مگر تم نہ سنبھلیں۔ حالاں کہ تم اگر چاہتیں تو یہ مشکل بات نہ تھی میں تم سے آخری بار صرف گذارش ہی کر سکتا ہوں کہ باجی اس گندے اور متعفن راستہ کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا کر دگی تو میں شاید تم سے جلد مل سکوں۔ ورنہ تم اپنی زبان

پر فیاض کا نام نہ لانا اور سمجھ لینا کہ والدین کے ساتھ فیاض بھی مرچکا ہے۔

اس لئے کہ جو زبان ریاکاری کے تالے بننے کے کام آتی بیہودہ زبان میرا نام لینے کا کوئی حق نہیں رکھتی تمہیں آخری بار ایک اور موقع دینے کے لئے سو روپے کا نوٹ میں نے تمہارے صندوق میں رکھدیا ہے۔

یہ سو روپے تمہیں شریفانہ اور صابرانہ زندگی گذارنے میں بہت سازگار ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ روپے بلکہ میرا ارادہ ہے کہ ایک دو ماہ بعد بھی میں تمہاری گذر کے لئے روپے بھیجتا رہوں۔ مگر اسی شرط پر کہ تم نیکی کے راستہ پر آجاؤ۔ ورنہ یہ سو روپے میری طرف سے آخری امداد سمجھنا۔ دونوں راستے تمہارے سامنے ہیں ایک راستے کا اختتام نور سحر پر اور دوسرے کا اختتام تاریک رات پر ہوتا ہے جس راستے کو چاہو اپنالو۔ میری تلاش میں وقت گذارنا محض فضول ہوگا اس سے زیادہ بہتر ہوگا کہ تم یہ وقت بھی اپنی اصلاح میں خرچ کرو۔ فقط

تمہارا بدنصیب بھائی

فیاض

زاہدہ خط پڑھکر سکتہ میں رہ گئی اور سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اس کے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی اسے یہ یقین کبھی نہ تھا کہ فیاض ایسا بھی کر سکتا ہے، ورنہ وہ سب کچھ برداشت کر لیتی مگر اسے نہ جانے دیتی۔ اسے فیاض سے نہ صرف محبت ایک بھائی کی حیثیت سے تھی بلکہ وہ اسے اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ وہ کئی گھنٹہ تک اسی طرح بیٹھی روتی رہی۔ اس کے پپوٹے سوجھ گئے، چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور شوخ آنکھیں حلقہ بگیر ہو کر رہ گئیں۔

اسے سب سے زیادہ رونا اس بات پر آرہا تھا کہ فیاض نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا اس پر نہ جانے کیا کیا بیتے گی۔ اور جب مصائب سے گھبرائے گا تو اس وقت کس کو پکارے گا اور کون اس کی مدد کرے گا۔

حنیف کا ایک انتقام تو پورا ہو چکا تھا۔ وہ زاہدہ کو اکرم سے علیحدہ کرا کے مفلس و بدحال بنا چکا تھا۔ اور یہ ہی اس کا پہلا انتقام تھا۔ مگر ابھی تک وہ اکرام سے پوری طرح انتقام نہ لے سکا تھا۔ حالاں کہ نیلوفر نے پوری طرح پنجے گاڑ لئے تھے اور اکرم ان میں اچھی طرح پھنسا ہوا تھا۔

ابھی یہ سب کچھ انتقام کی تمہید تھی۔ انتقام نہ تھا۔ نیلوفر نے اپنی رہائش بھی تبدیل کر لی تھی تاکہ اکرم کو یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ وہ ایک طوائف کی لڑکی ہے۔

نیلوفر کے اس نئے مکان کو بھی اکرم نے اسی طرح آراستہ کیا تھا جس طرح زاہدہ کے لیے کیا تھا بلکہ زاہدہ سے زیادہ تکلفات برتے گئے تھے۔

نیلوفر نے سب سے بڑی یہ ریاکاری برتی تھی کہ وہ اکرم کو محض بہانوں اور فریبوں میں رکھ کر کھیل رہی تھی۔

اکرم گو اس سے اظہار محبت کر چکا تھا۔ مگر نیلوفر نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ اکرم کو نہ تو امید ہی ہوئی اور نہ بے باک ہونے کی ہمت۔ اکرم رات کو نیلوفر کے گھر ہی سوتا تھا مگر کیا مجال کہ نیلوفر سے لغزش ہو جائے۔ وہ اپنے کمرے کو بند کر کے تنہا سوتی تھی۔ اور دوسرے کمرے میں اکرم تمام رات ارمانوں سے بہلا کرتا۔

نیلوفر جو کچھ اکرم سے وصول کرتی فوراً اسے اپنی ماں کے پاس بھجوا دیتی۔

حتیٰ کہ زیورات بھی ماں کو بھجوا دیے اور اکرم سے کہہ دیا کہ میں نے ایک غریب سہیلی کی شادی پر وہ زیورات دے دیے اور اکرم اُن سے کچھ نہ کہہ سکا بلکہ اور بنوا دیے۔ اس مسلسل نازبرداری نے اکرم کی مالی حالت خراب کر دی تھی۔ اس کے بیوی بچے بہت پریشان تھے آخر اکرم نے انتہائی سختی سے کام لے کر اپنی بیوی کو اس کے میکے بھیج دیا اور نیلوفر کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔

ایک دن نیلوفر نے اکرم سے فرمائش کر دی کہ اگر تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو اور مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتے ہو۔ تو اپنے مکان اور دو دکانیں میرے نام منتقل کرا دو۔

اکرم کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ نیلوفر کے ذرا سے اشارے پر جان تک دیدینے کو تیار تھا۔

دوسرے ہی دن اکرم نے کل جائیداد نیلوفر کے نام کر دی۔ مگر احتیاطاً اکرم نے یہ شرط رکھی کہ اگر نیلوفر نے اس کے ساتھ شادی نہ کی تو وہ اس ملکیت سے محروم کر دی جائے گی۔ مگر نیلوفر اس شرط سے بگڑ گئی اور کہنے لگی۔

"تم مجھے خریدنا چاہتے ہو تم نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ تم نے میرا مذاق اڑایا ہے بس اٹھا لو یہ کاغذات اور آگ لگا دو ان کو۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہاری جائیداد میں کوئی بھوکی ننگی ہوں۔ جو خیرات دینے آئے ہو۔ میں تم جیسے سوداگروں سے کبھی شادی نہیں کر سکتی۔"

اکرم :- مگر تم تو اس قدر خفا ہو گئیں ذرا سی بات کو اتنا طول نہ دو۔

نیلوفر :- طول سے کیا مطلب میں نے تو بات مختصر کر دی کہ نہ مجھے جائیداد چاہیئے اور نہ میں شادی کروں گی یہ سودے بازی کا رنی ہو تو راولپنڈی میں تم سے زیادہ مالدار بھی پڑے ہیں۔

اکرم :۔ مگر کم از کم مجھے تو معلوم ہو جائے کہ میں اپنا سب کچھ دیکر تمہیں حاصل کر سکوں گا۔

نیلوفر :۔ مجھے اس یقین دہانی کی ضرورت نہیں ہے جب میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں تو یقین دہانی کس بات کی۔

اکرم :۔ تو پھر میں کیا کروں۔

نیلوفر :۔ جو جی میں آئے کرو۔ میں نے تو ہمدردی ہی کے لئے جائیداد کو منتقل کرانا چاہا تھا۔ میرے بغیر کیسے بیش قیمت تحفے لے آتے ہو کل کو ساری جائیداد قرضہ پر چڑھ گئی تو کیا ہو گا تمہارے ہی بیوی بچے بھوکے مریں گے۔ اور میرا تو ذکر ہی کیا۔ مگر تم اسے سودے بازی سمجھتے ہو تو سمجھا کرو۔

اکرم : خیر یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہیں صرف مجھ سے ہمدردی ہی نہیں بلکہ محبت ہے مگر میں نے یہ سب کچھ بے سوچے سمجھے کیا تھا

نیلوفر :۔ خیر تو کیا ہو گا۔ جائیداد تو ابھی تمہارے پاس ہی ہے۔

اکرم :۔ اچھا چلو میں یہ شادی کی شرط کاغذات میں سے نکالے دیتا ہوں۔ اب تو خوش ہو۔

نیلوفر :۔ پھر دہی گو یا طعنوں سے کام لیتے رہو گے۔

اکرم :۔ اب یہ بحث چھوڑو۔ لو یہ شرط میں نے کاٹ دی

مگر کم از کم زبانی تو بتا دو کہ اب شادی کب اور کس دن ہو گی۔

نیلوفر:۔ میں کہہ چکی ہوں کہ شادی کی شرط اس جائیداد کے ساتھ نہیں رہے۔ پھر بتاؤں گی اس وقت نہیں بتاؤں گی۔

آخر اکرم نے مجبور ہو کر شادی کی شرط کے بغیر تمام جائیداد نیلوفر کے نام کر دی۔ عدالت سے یہ دونوں تقریباً شام کے چار بجے فارغ ہو کر گھر آئے۔

گھر آتے ہی نیلوفر نے اکرم کو پھر کسی بہانے سے بازار بھیج دیا۔ اور یہ سب کاغذات اپنی ماں کے پاس پہنچا دیئے۔

جب اکرم واپس آیا تو نیلوفر نے کہا۔

" میں رات دس بجے کی گاڑی سے لاہور جانا چاہتی ہوں تاکہ اپنی والدہ سے شادی کے متعلق بات چیت کر سکوں"

اکرم:۔ اچھا تو تم نے اب تک مجھ سے یہ کیوں چھپایا کہ تمہاری والدہ لاہور میں ہیں۔

نیلوفر:۔ چھپانے میں بھی مصلحت تھی۔ تو کیا تم مجھے لاوارث سمجھے ہوئے تھے۔

اکرم:۔ خدا نہ کرے۔ بہر حال چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں

نیلوفر:۔ مگر میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتی۔

اکرم:۔ کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

نیلوفر:۔ یہ میری خاندانی روایات کے خلاف ہے کہ

اپنے ہونے والے شوہر کو ساتھ لے کر جاؤں،

اکرم:۔ تب تو یہ جدائی کی گھڑیاں کیسے کٹیں گی،

نیلوفر:۔ بس کل رات کو واپس آجاؤں گی،

غرض اکرم کو اجازت دینی پڑی۔ نیلوفر نے ضروری سامان اور بستر باندھا۔ اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اکرم نے پوچھا "وہ کاغذات تم نے کہاں رکھدیئے"؟

نیلوفر:۔ وہ میں نے احتیاط سے رکھدیئے ہیں تمہیں انکی کیا فکر ہے،

اکرم:۔ اس لئے کہ وہ کاغذات اہم ہیں ان کی احتیاط ضروری ہے میری پرانی دستاویزات بھی ان میں ہیں،

نیلوفر:۔ سب ٹھیک ہے میں نے انہیں حفاظت سے رکھدیا ہے،

مگر اکرم کو نیلوفر کی ان باتوں پر شبہ سا ہوا۔ ایک دم لاہور جانا، کاغذوں کا پتہ نہ دینا اور بے تکلفی سے یہ کہدینا کہ وہ شادی کی تاریخ مقرر کرنے جا رہی ہے یہ سب چیزیں اس کے لئے غور طلب تھیں، دوسرے یہ کہ شام ہی کو اس نے دس ہزار روپیہ ادھر ادھر سے قرض لاکر اس کی فرمائش کے مطابق دیا تھا، اور وہ روپیہ بھی نیلوفر کے بیان کے مطابق کاغذات کے ساتھ رکھا تھا حالاں کہ نیلوفر نے یہ روپیہ اپنے صندوق میں رکھا تھا۔

نیلوفر کو روپیہ رکھتے دیکھکر اکرم قصداً نظریں بچا گیا تھا ان تمام باتوں سے اکرم کا شک بڑھنے لگا اور اس نے نیلوفر سے اصرار کیا کہ وہ اسے دکھلائے کہ کاغذات کہاں رکھے ہیں،

نیلوفر نے غصہ سے کام لیا اور آپے سے باہر ہونے لگی۔ اکرم نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ یہ ایک چال تھی جس میں نیلوفر کامیاب ہو گئی ہے اور وہ سب کچھ لیکر بھاگ جانا چاہتی ہے

اکرم نے پہلی مرتبہ ہمت سے کام لیکر نیلوفر کا صندوق کھولا اور دس ہزار روپے نکال کر اپنے صندوق میں رکھ لئے اور پھر اس کا تمام زیور بھی اتار کر رکھ لیا اور نیلوفر سے کہا،

"آج تم کہیں نہیں جا سکتی۔ آج میری آرزوؤں کی تکمیل کی رات ہے"،

جب نیلوفر نے دیکھا کہ اکرم کی نیت خراب ہے اور وہ یقیناً دست درازی سے باز نہ آئے گا تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا بازار والے جمع ہو گئے اور پولیس نے دونوں کو حراست میں لے لیا،

نیلوفر نے الزام لگایا کہ اکرم اس کی عصمت دری کرنا چاہتا تھا۔ مگر نیلوفر کی یہ بات پولیس کی نظروں میں قابل قبول نہ تھی کیوں کہ ایک تو وہ اکرم کو جانتے تھے دوسرے پولیس انسپکٹر نیلوفر سے واقف تھا اور جب انسپکٹر نے اکرم کو یہ بتایا کہ یہ نیلوفر تو مقامی طوائف کی لڑکی ہے تو اکرم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ وہ اپنی تمام جائیداد نیلوفر کے نام کر کے اپنے ہاتھ کاٹ چکا تھا۔ اس نے کل واقعہ انسپکٹر کو بتایا۔ انسپکٹر بھی حیرت میں رہ گیا۔ اور اکرم سے کہا۔

"آپ نیلوفر کے خلاف فریب دہی کی رپورٹ لکھا دیں جائیداد کی رجسٹری آج ہوئی ہے اور آج ہی یہ واقعہ ہوا ہے۔ عدالت کو آپ یہ ثابت کر سکیں گے کہ اس لڑکی نے آپ کو دھوکہ دے کر جائیداد اپنے نام کرائی ہے"

اکرم نے ایسا ہی کیا نیلوفر کو چھوڑ دیا کیوں کہ اس پر فی الوقت کوئی الزام عائد نہ ہوتا تھا بلکہ عدالت ہی اسے سزا دے سکتی تھی۔ اکرم کی آنکھیں اب کھل چکی تھیں۔ مگر اس وقت کہ جب وہ اپنی کل پونجی لٹا چکا تھا۔ سب سے پہلے وہ اپنے بیوی بچوں کو واپس لایا اور اس کے بعد وہ زاہدہ کے پاس پہنچا۔ اکرم کا خیال تھا کہ اس نے زاہدہ کے ساتھ واقعی زیادتی کی ہے۔ جب اس نے زاہدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو زاہدہ کو یقین نہ آتا تھا کہ اکرم واپس بھی اس کے پاس آسکتا تھا۔

زاہدہ اب عجیب الجھن میں تھی کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے اگر دروازہ کھولتی ہے تو پھر گھناؤنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور فیاض کی بات سچ دکھائی

دیتی ہے۔ اور اگر نہیں کھولتی ہے تو اس کی محبت مجروح ہوتی ہے۔ وہ چند منٹ سوچتی رہی اور آخر کار خود بخود اس کے ہاتھ زنجیر کی طرف اٹھ گئے اور اس نے دروازہ کھولدیا۔

اکرم زاہدہ کو دیکھکر آنسو بھر لایا۔ زاہدہ کی آنکھیں سوجھی ہوئیں، بال بکھرے ہوئے، اترا ہوا چہرہ اور میلے کپڑے اس کی بدحالی کا ثبوت دے رہے تھے۔ اکرم نے زاہدہ کی اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"میری زاہدہ مجھے معاف کردو۔ میں بہت ظالم ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہاری یہ حالت ہو جائے گی۔ اب میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤنگا"

اور زاہدہ جواب میں اس قدر روئی کہ ہچکی بندھ گئی اور ساتھ میں اکرم بھی روتا رہا کئی گھنٹہ بعد جاکر زاہدہ کی طبیعت کچھ ہلکی ہوئی تب اکرم نے نیلوفر کا سارا قصہ سنایا۔ زاہدہ نے ساری داستان سن کر کہا۔

"یہ زاہدہ نہیں ہے کہ اکرم صاحب کے ذرا سے کہنے پر مکان پھر اس کے نام کردے"۔

اکرم :۔ مجھے ابھی تو معلوم ہوا ہے کہ بیسوا اور شریف لڑکی میں کیا فرق ہے۔ تم نے میری ہر چیز واپس کردی حالاں کہ اگر تم ایسا نہ کرتیں اور قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتیں تو یہ سب چیزیں تم سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا مگر ان مجھ سے کیسا ظلم ہوا ہے نیلوفر نے تو مجھے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ساری پونجی ہضم کر گئی نہ اب میرے پاس نقد روپیہ ہے نہ کوئی اسٹور نہ جائیداد۔ اپنے بیوی بچوں کو ابھی ابھی واپس لایا ہوں مگر اب میرا

مکان میرا نہیں ہے۔ جب تک عدالت فیصلہ نہ کر دے۔ مجھے اپنے مکان کا کرایہ نیلوفر کو ادا کرنا ہوگا۔ بہرحال اس حال میں میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ کیا تم قبول کر دگی۔

زاہدہ یہ سن کر خاموش ہو گئی اور پھر اکرم کے پیہم اصرار پر اٹھ کر فیاض کا خط لے آئی اور اسے دے دیا۔ اکرم نے خط کو پڑھا اور ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"اس تو فیاض نے ساتھ چھوڑ دیا بہرحال تم فکر نہ کرو میرے پاس دس ہزار روپے اور زیورات موجود ہیں اب تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی اور انشاءاللہ تمہاری زندگی بھی گھناؤنے ماحول میں نہ گذرے گی۔

زاہدہ :۔ کیا مطلب ؟

اکرم :۔ یہی کہ میں اب اس مقدمے بازی سے نمٹ کر تم سے شادی کر لوں گا۔

زاہدہ نے پھر اپنی گردن جھکالی اور کچھ سوچنے لگی۔ اکرم نے اس کا سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

" زاہدہ کیا بات ہے تم کیا سوچنے لگیں "

زاہدہ :۔ میرے لئے اب سوائے خودکشی کے کوئی راستہ نہیں ہے۔

اکرم :۔ آخر تم اتنی بد دل کیوں ہو۔

زاہدہ :۔ بدول ! معاف کرنا اکرم تم بھی آج جب زمانے نے ستایا تو میرے پاس چلے آئے۔ ورنہ تم نے یہ کبھی نہ پوچھا کہ میں نے

روٹی کھائی ہے یا نہیں ایک کتے کی بھوک کا بھی اس کے مالک کو احساس ہوتا ہے۔ مگر تم میرے مالک ہونے کے باوجود ایسے گئے کہ میرے ایک آنسو کو بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ عورت کس قدر مجبور و بے بس ہے اس دنیا میں اس کا کوئی بھی تو نہیں ہے ....

اکرم :۔ میں نے تم سے معافی مانگ لی ہے میں اپنے کیے پر بہت نادم ہوں، اب تو شرمندہ نہ کرو۔

زاہدہ :۔ خدا کی قسم اکرم میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہی ہوں، بلکہ عورت کی مجبوریوں کا احساس دلا رہی ہوں۔ مرد کی طبیعت رنگین ہو، جہاں بہار دیکھی بھنورے کی طرح اڑ کر وہاں پہنچ گیا۔ تم نے معافی مانگ لی اور بات ختم ہو گئی مگر کیا میں ان تکلیفوں کو بھلا سکتی ہوں جو تمہارے رویہ سے میں نے برداشت کی ہیں۔

اکرم میں تم پر اعتراض نہیں کرتی مگر یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میری بے بسی کس قدر عجیب ہے پھر اب میرے سامنے کئی سوال ایسے چکر لگا رہے ہیں جنھوں نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ تمہارے قرب سے محروم ہو گئی تھی تو قسمت کی بدنصیبی پر صبر آ گیا تھا، مگر تم پھر آ گئے۔ ادھر فیاض کا یہ کہنا ہے کہ میں گھٹ گھٹ کر زندگی نہ گزاروں۔ اور ادھر شرعی پابندی یہ ہے کہ میں بغیر پہلے شوہر سے طلاق حاصل کیے شادی نہیں کر سکتی ایک مجبور عورت کے لئے کون سا راستہ ہے جو وہ اختیار کر سکتی ہے۔

اکرم :۔ دیکھو زاہدہ تم ان الجھنوں میں نہ پڑو۔ ورنہ ذہنی

پریشانیاں اور بڑھ جائیں گی۔ جب تک تمہارا شوہر واپس نہیں آتا ہے اس وقت تک میں تمہیں اکیلا نہ چھوڑوں گا۔ رہا فیاض، تو اسے جب معلوم ہوگا کہ میں نے تمہیں پھر اپنا لیا ہے تو وہ یقیناً واپس آجائے گا۔ کیوں کہ اسے میری شرافت پر بڑا اعتماد تھا

زاہدہ:۔ سب کچھ سہی مگر اکرم تم مجھے پھر ریاکاری زندگی کی ترغیب دے رہے ہو۔ اچھا اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے یا ہمدردی ہے تو میرا ایک کام کروگے۔

اکرم:۔ ایک نہیں دو۔

زاہدہ:۔ تمہارے بیوی بچے تو گھر آگئے ہیں نا۔

اکرم:۔ ہاں، ابھی کچھ دیر پہلے انہیں لیکر آیا ہوں۔

زاہدہ:۔ تمہارے پاس ملازمہ ہے کوئی۔

اکرم: نہیں کل پرسوں تک آجائے گی۔ مگر کیوں۔

زاہدہ:۔ بس تو اکرم مجھے اپنے ہاں ملازمہ رکھ لو۔ میں تمہارے بیوی بچوں کی خدمت کروں گی تم جو تنخواہ دو مجھے منظور ہے۔

اکرم:۔ آخر زاہدہ تمہیں کیا ہو گیا ہے

زاہدہ:۔ میں اب گناہ کی زندگی گزارنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔

اکرم:۔ تمہیں کون کہتا ہے۔

زاہدہ:۔ اکرم تم دیکھتے ہو کہ فیاض کے چلے جانے سے

میرا کیا حال ہو گیا ہے، اور میں فیاض کو ہر قیمت پر واپس بلانا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے ماں کی طرح پالا پوسا ہے۔ مجھے اپنے بچے کا افسوس نہیں تھا مگر فیاض کے چلے جانے کے بعد میرا عجیب عالم ہو گیا ہے۔ مجھے یہ ساری دنیا تاریک اور بھیانک دکھائی دے رہی ہے،

اکرم:۔ تم گناہ کی زندگی سے بچنا چاہتی ہو اور میں تمہارا ساتھ دیتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ تمہاری طرف کبھی بری نظر سے نہ دیکھوں گا۔ اور جب تک تمہیں شوہر سے طلاق حاصل نہ ہو جائے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار دیتا رہوں گا اب میں تمہارے پاس تسکین جذبات کے لئے نہیں آیا بلکہ اپنے کئے پر نادم ہو کر تمہاری خدمت کرنے کے لئے آیا ہوں۔

زاہدہ:۔ مگر میں تو محنت کر کے کھانا چاہتی ہوں میں تمہارے گھر کا کام کروں گی اور تنخواہ لوں گی، میں تمہارے بیوی بچوں کی خدمت کروں گی

اکرم:۔ لیکن تم ایسا کیوں کرتی ہو،

زاہدہ:۔ اکرم مجھے ایک موقع تو دو باعزت زندگی گذارنے کا

اکرم:۔ زاہدہ تمہاری یہ ضد میری سمجھ سے باہر ہے تم خود ہی ذرا سوچو کہ جسے میں کل محبوبہ بنا کر اپنی نظروں میں بٹھاتا تھا اسے آج کس طرح گھر کی خادمہ بنا لوں،

زاھدہ :۔ اگر تم واقعی اپنے کیے پر نادم ہو اور مجھے نیک زندگی گزارنے کا موقع دینا چاہتے ہو، تو تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔

اکرم :۔ زاہدہ میں تمہارا ہر کہا پورا کرنے کو تیار ہوں مگر یہ بات اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

زاھدہ :۔ تمہارا یہ اقدام تمھارے پچھلے گناہوں کی تلافی کر دے گا۔

اکرم :۔ اچھا تو ایک شرط ہے۔

زاھدہ :۔ کہو۔

اکرم :۔ ایک نہیں بلکہ دو۔

زاھدہ :۔ ہاں ہاں کہو۔

اکرم :۔ دو نہیں بلکہ تین۔

زاھدہ :۔ کچھ کہو تو، ہزار شرطیں گنا دو۔

اکرم :۔ پوری کرو گی۔

زاھدہ :۔ سب پوری کروں گی بشرطیکہ گناہ کی ترغیب دینے والی نہ ہوں۔

اکرم :۔ نہیں نہیں ایسی نہیں۔

زاھدہ :۔ تو پھر کہو کہتے کیوں نہیں۔

اکرم :۔ تو سنو۔ تم کبھی میلے لباس میں اور بغیر بناؤ سنگار کے نہیں رہو گی۔ تمہیں ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی رہے گی۔

تمہیں کھانا ہم سب کے ساتھ کھانا پڑے گا۔

زاہدہ :۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو گا۔

اکرم :۔ وہ کیوں نہیں؟

زاہدہ :۔ کیونکہ تمہاری تینوں شرطیں ملازمہ کی تعریف میں نہیں آتیں۔

اکرم :۔ دیکھو زاہدہ اگر تم نے زیادہ حجت کی تو پھر میں بھی اپنی بات سے منکر ہو جاؤں گا۔ لہذا خیریت اسی میں ہے کہ کل صبح میں آؤں گا۔ میرے ساتھ گھر چلی چلنا۔ میں اپنی بیوی سے تمہارا تعارف کرا دوں گا۔

مجبوراً زاہدہ کو یہ شرطیں ماننی پڑیں۔ اور اکرم چلا گیا۔

زاہدہ رات گئے تک کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح کو شاید اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی اکرم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ حالانکہ صبح ہی آنے کے لئے کہہ گیا تھا۔ اسے عجیب و غریب خیال آنے لگے۔ کہیں اکرم نے اپنا خیال نہ بدل دیا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر نہ پاتے ہوئے کہیں اپنا ارادہ تو تبدیل نہیں کر دیا۔ کہیں اس نے بیوی سے ذکر کیا ہو اور اس نے اکرم کو منع کر دیا ہو وہ پریشان ہے ممکن ہے اس نے میرا بوجھ اٹھاتے میں اور پریشانی خیال کی ہو۔ ابھی وہ خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ زاہدہ نے دروازہ کھولا تو دیکھا۔ اکرم ایک اچھی کیس

ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ وہ اندر آ گیا، اور مسکراتے ہوئے اٹیچی کیس زاہدہ کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولا،

"یہ تمہارے لئے کپڑے بھی لے آیا ہوں، ایک جوڑا جلدی سے پہن لو، اور میرے ساتھ چلو"۔

زاہدہ نے حیرت سے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا،

" آپ نے پھر وہی کیا ہے"،

اکرم: میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا،

زاہدہ:۔ بھلا میں ان قیمتی کپڑوں کو پہن کر میں آپ کے گھر جاؤں گی تو آپ کی بیوی کیا کہے گی، یہ کپڑے بھلا کسی ملازمہ کے ہو سکتے ہیں،

اکرم:۔ اب بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے میں ذمہ دار ہوں، تم جلدی سے کپڑے پہن لو،

زاہدہ نے کپڑے بدل لئے، وہ پھر ایک مرتبہ جانِ بہار بن گئی، اس کا حسن ایک مرتبہ پھر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ چمکنے لگا، اکرم اسے دیکھ کر مسکرایا اور نظریں نیچی کرلیں زاہدہ جھینپتے ہوئی بولی،

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں"؟

اکرم:۔ مگر میں نے نظریں جھکا لی ہیں،

شرط یہی تھی کہ میں تمہیں بری نظر سے نہ دیکھوں گا، زاہدہ بھی مسکرا دی اور کان کا ٹالا لگا کر اکرم کے ساتھ اس کے گھر پہنچی، اکرم کی بیوی

رضیہ نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا، وہ سمجھی کہ پھر نئی آفت آئی، مگر فوراً ہی اکرم نے رضیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"رضیہ ان سے ملو یہ ہیں زاہدہ میرے دوست جاوید کی بیوی، بیچاری بہت پریشان تھیں میں انھیں یہاں لانا چاہتا تھا مگر بڑی ضدی ہیں۔ جب تک انھوں نے کچھ شرطیں منظور نہ کرالیں، اس وقت تک میرے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئیں"۔

رضیہ :۔ اوہو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، مگر وہ شرطیں کیا تھیں اور انھیں تکلف کیوں تھا، یہ گھر بھی تو انھیں کا ہے،

اکرم :۔ ان کے شوہر کئی سال سے لاپتہ ہیں یہ ملازمت کے لئے ایک جگہ گئی تھیں میں بھی وہیں بیٹھا تھا، میں انھیں گھر لے آیا مگر اس شرط پر کہ یہ تنخواہ لیں گی، کام کریں گی۔ اور کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گی،

رضیہ :۔ ارے واہ آپ بھی خوب ہیں انھیں جتنے روپوں کی ضرورت ہو لے لیں، بھلا ملازمہ کی حیثیت سے ایک دوست کی بیوی کو گھر لاتے ہوئے آپ کو خیال نہ آیا،

اکرم :۔ میں نے تو لاکھ کہا کہ میرا گھر تمہارا اپنا ہے مگر یہ نہ مانیں اور آخر مجھے مجبوراً انھیں ملازمہ کی حیثیت سے لانا پڑا، ورنہ یہ کہیں اور ٹھوکریں کھاتیں، زمانہ ویسے ہی خراب ہے

رضیہ :۔ نہیں نہیں میں گھر کا کام انھیں کبھی نہ کرنے دوں گی واہ یہ بھی کوئی بات ہے،

زاھدہ :۔ بہن تمھاری محبت کا کس طرح شکریہ ادا کروں مگر میں نے اپنے شوہر سے قسم کھائی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو میں محنت کے پیسے سے زندگی گذار دوں گی۔

رضیہ :۔ ہاں ہاں۔ سب محنت ہی ہے۔

زاھدہ :۔ نہیں رضیہ بہن اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔

اکرم :۔ رضیہ یہ بہت ضدی ہیں۔ ان سے بحث نہ کرو۔ اچھا زاہدہ تم سامنے والے کمرے میں قبضہ جما دو کام کرو۔ چلو بس قصہ ختم۔ زاہدہ اور رضیہ مسکرادیں۔ رضیہ خود زاہدہ کے ساتھ گئی اور ایک سجے ہوئے کمرے میں اس کے کپڑے کی اٹیچی کیس رکھدی۔ رضیہ کہنے لگی "زاہدہ بہن مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی یہ تو دن بھر پھرتے رہتے ہیں رات کو بھی دیر سے آتے ہیں اور میں بات کرنے کو بھی ترستی تھی۔ اب مجھے پرواہ نہیں یہ چاہے رات کو جس وقت مرضی ہو آئیں۔

زاھدہ :۔ اجی واہ دیر سے تو آکر دیکھیں۔ مردوں کا رات کو غائب رہنے کا کیا کام۔ دن بھر تو کام وغیرہ میں گذر جاتا ہے۔

رضیہ نے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مگر تمھیں کیا پتہ۔ ان کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے تمام پونجی ایک طوائف کی نظر کر دی۔ اب مقدمہ چلے گا جب کوئی فیصلہ ہوگا۔ ورنہ تو نام رہ گیا ہے دولت تو ختم ہی ہو چکی ہے"۔

اچھا جی! زاہدہ نے حیرت سے کہا،

"تو اکرم صاحب کی یہ حالت ہوگئی ہے آوارہ بھی ہو گئے ہیں،

رضیہ:۔ کیا بتاؤں بہن میرے دن بڑے سکون سے گذر رہے تھے اور یہ کسی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، مگر ایک دم پتہ نہیں کسی نے جادو کر دیا کہ بڑے رنگین ہو گئے ہیں، میں بھی کل ہی میکے سے آئی ہوں، ورنہ مجھے بھی خیرباد کہہ دیا تھا،

زاہدہ :۔ تم فکر نہ کرو بہن اگر میری جان میں جان ہے تو دیکھوں گی کہ یہ نو بجے کے بعد گھر سے باہر کیسے رہتے ہیں۔

رضیہ :۔ مگر زاہدہ بہن یہ تو بڑے ضدی ہیں۔ کچھ نہیں مانتے بس جو دماغ میں آجائے اسے پورا کر کے ہی دم لیتے ہیں، کیا مجال جو کسی کے سمجھانے سے باز آجائیں،

زاہدہ :۔ دیکھوں گی کیسے باز نہیں آتے،

رضیہ :۔ خدا کرے بہن یہ تمہارے کہنے سے باز تو آجائیں،

زاہدہ :۔ مجھے بھی کسی بات پر ناز ہے دیکھئے تو۔"

اتنے میں اکرم بھی آگیا، اور کہنے لگا،

"کیا بغاوت ہو رہی ہے میرے خلاف"،

رضیہ نے مسکرا کر کہا،

"کرفیو لگا دینے کا ارادہ ہے زاہدہ بہن کا، کہتی ہیں میرے

سامنے نو بجے کے بعد آکر دیکھیں۔

اکرم:۔ اچھا جی تو اتنی جلدی میری تمام رپورٹ بھی پیش کر دی گئی۔ اور چند قہقہوں میں بات ختم ہو گئی۔

حنیف اپنا انتقام لینے کے لئے بے چین تھا۔ کیوں کہ نیلوفر والا داؤ بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا بلکہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ اور جاوید سے بھی ایک ہی ملاقات کے بعد دوبارہ ملنا نہ ہوا۔

پہلے تو حنیف نے جاوید سے مل کر تجدید ملاقات کی اور پھر واپس آ کر کسی نئی اسکیم کے متعلق غور کرنے لگا۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اکرم زاہدہ کو اپنے گھر لے گیا ہے۔

اس خبر سے حنیف کی جو کچھ رہی سہی ملنے کی امید تھی وہ بھی جاتی رہی۔ مگر وہ بھی چپکا بیٹھنے والا نہ تھا اس نے فوراً ہی ایک عیار عورت جمی سے بات چیت کی اور اسے رضا مند کر لیا کہ وہ اکرم کی بیوی رضیہ سے جا کر گفتگو کرے اور اس کو زاہدہ کے متعلق بتا دے۔

لہٰذا اسی اسکیم کے تحت جمی ایک دن دوپہر کو اکرم کے گھر پہنچی۔ ضعیف عورت ہاتھ میں ڈنڈے کا سہارا لیے کمر جھکی ہوئی، چہرے پر موت منڈلاتی ہوئی۔ چلنے سے عاری۔ جب یہ اندر داخل ہوئی تو

رضیہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی چھالیاں کتر رہی تھی اور زاہدہ صحن میں کھڑی بال سکھا رہی تھی۔ جمی نے آتے ہی زاہدہ کو ذرا آنکھیں میچ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"زاہدہ بٹیا! اے ہے تم یہاں"۔

زاہدہ نے بڑے غور سے دیکھکر کہا۔

"بڑی بی میں نے آپ کو پہچانا نہیں"۔

"بٹیا تو اب مجھے کیا پہچانے گی مگر میں تجھے، تیری ماں کو، تیرے شوہر کو غرض سب کو جانتی ہوں"۔

یہ کہکر وہ رضیہ کے پاس آ بیٹھی

زاہدہ یہ سن کر اس کے پیچھے پیچھے اندر آئی اور حیرت سے بولی۔

"مگر بڑی بی میں نے تو تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں"۔

جمی نے رضیہ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اللہ اپنا کرم رکھے بٹی! جسے تو دیکھ لے۔ اس پر اللہ کی رحمت بھی بند ہو جائے۔

اس فقرے سے تو زاہدہ کا دل دھڑکنے لگا۔ ابھی وہ کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی۔ کہ جمی رضیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"بٹی یہ لڑکی تو شہر میں بدنام ہے اپنی ماں سے بھی زیادہ نام پایا ہے" اس کا شوہر تو اس کے لچھن دیکھکر کب کا چھوڑ چکا ہے اور اب یہ تیرے شوہر کو جونک بن کر لپٹ گئی ہے"۔

جمی :۔ پتہ ہے تیرا شوہر کس کے پیچھے بگڑا ہے۔

رضیہ :۔ نہیں تو مجھے علم نہیں۔

جمی :۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ اور اب تیرے شوہر نے دیکھا کہ راتوں کا غائب رہنا اچھا نہیں تو گھر لے آیا۔

زاہدہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"بڑی بی خدا کے لئے کسی کی بے عزتی نہ کرو"

جمی :۔ اے ہے تیری عزت۔ میں تو دعا مانگتی ہوں کہ مجھے موت ہی آجائے اس وقت جب تیری سی عزت ملے۔

پھر رضیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹی رضیہ میں تم سے اور تمہارے شوہر اکرم میاں سے دلی ہمدردی رکھتی ہوں۔ میں نے جو دیکھا بتانا تھا بتا دیا۔ اب بیٹی تو جان تیرا کام مجھے کسی کے درمیان میں بولنے سے کیا مطلب"۔

رضیہ :۔ مگر بڑی بی تم اسے کیسے جانتی ہو۔

جمی :۔ بس دو چار مرتبہ اس جگہ دیکھا تھا جہاں اکرم میاں نے اسے مکان لے کر رکھا تھا۔ اچھا رضیہ بیٹی میں چلی۔ آئی تھی کس لئے اور بات کہاں کی چھڑ گئی۔ اب پھر آؤں گی۔

جمی یہ کہکر سیدھی اپنے گھر آگئی۔

زاہدہ رونے لگی اور رضیہ کے ذہن میں مختلف مناظر رقص کرنے لگے وہ سوچ رہی تھی۔

"یہ تو کوئی آوارہ لڑکی ہے اور یہ وہی ہے جسے انھوں نے مکان خرید کر علیحدہ رکھا تھا۔ انصار نے مجھ سے کتنی بار کہا تھا کہ آپا میں نے دولہا بھائی کو اس مکان میں آتے جاتے دیکھا ہے وہاں ایک لڑکی رہتی ہے اور دولہا بھائی اکثر اس کے ساتھ سینما وغیرہ بھی جاتے ہیں"

"یہ ڈائن مجھے ڈسنے کو میرے ہی گھر میں آ گئی۔ میں بھی تو کہوں کہ گھر کا کام کرے گی۔ تنخواہ لے گی، کھانا ساتھ کھائے گی۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے۔ ورنہ ملازم رکھنی ہوتی تو ہزار دو ہزار روپے دے کر بھی رخصت کر سکتے تھے۔ اور دیکھو اب وہ رات کو بھی تو سویرے آجاتے ہیں۔ بارہ بارہ ایک بجے تک زاہدہ سے ہی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

"میں بھی حیران تھی کہ یہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہیں۔ اس کے کہنے پر اتنا عمل کیوں کرتے ہیں اسے دیکھ کر پھولے نہیں سماتے وہ ہنستی ہے تو ان کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے میں بھی اس حرام زادی کو آج ہی گھر سے نکال کر دم لوں گی"

یہ سب کچھ اس نے اس قدر جلدی سوچ لیا کہ سکینڈوں میں کام ہو گیا۔ وہ زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر رونا ہے تو اپنے کمرے میں جا کر رو لو۔ میرے ہاں خدا نہ کرے کوئی موت ہو گئی ہے جو تم نے واویلا شروع کر دیا۔ یہ رونا

گھڑی دو گھڑی کا تو ہے نہیں۔ ساری عمر اپنی قسمت کو روتی رہنا۔

زاہدہ کو ان جملوں سے اور بھی دل دکھا اور وہ تقریباً چیختی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اور روتی رہی۔

شام کو اکرم گھر آیا تو رضیہ منہ پھلائے پلنگ پر لیٹی تھی بچے گود میں لوٹ رہے تھے۔ زاہدہ اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ اس نے گھر کا ماحول بدلا ہوا دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رضیہ کے قریب آ کر اور اس کا ہاتھ ماتھے پر سے ہٹا کر بولا۔

"کیا بات ہے۔ آج تو گھر میں خاک اڑ رہی ہے۔"

رضیہ کا دل بھر آیا اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"خاک تو آپ نے اڑا رکھی ہے اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو۔ اگر یہی مرضی تھی۔ تو مجھے بیکار میکے سے لائے۔"

اکرم نے بغیر معلوم کئے ہی قصہ کی نوعیت کو سمجھ لیا۔ مگر وہ حیران تھا کہ آخر رضیہ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ اس نے رضیہ کو تو کوئی جواب نہ دیا اور سیدھا زاہدہ کے کمرے میں آیا۔

زاہدہ ابھی تک رو رہی تھی۔ اس نے زاہدہ کے گدگدی کیں مگر وہ کروٹیں بدل کر اپنا چہرہ چھپاتی رہی اور جب اکرم نے کافی تنگ کیا تو وہ اور زور زور سے رونے لگی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور کہا۔

"مجھے آپ نے یہاں لا کر خواہ مخواہ رضیہ بہن کو تکلیف دی میرے لئے تو وہی تاریک کوٹھری اچھی تھی۔"

اکرم :۔ آخر مجھے بھی تو بتاؤ ہوا کیا ہے؟

زاھدہ :۔ رضیہ بہن نے نہیں بتایا۔

اکرم :۔ نہیں وہ بھی منہ پھلائے بیٹھی ہے۔

اکرم نے تفصیل پوچھی تو زاہدہ نے اس بوڑھی عورت کا واقعہ سنایا۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا کہ آخر وہ بوڑھی عورت کون تھی۔ اور وہ جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یقیناً یہ سب کارروائی کسی دشمن نے کی ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ اب گھر بلو بدانتظامی اور رضیہ کی بغاوت کو کس طرح ٹھیک کیا جائے۔

اس نے زاہدہ کو وہیں چھوڑا اور رضیہ کے پاس آکر کہنے لگا۔

"دیکھو رضیہ تم میری رازدار ہو، زندگی کی ساتھی ہو تمہاری وارفتگی اور جوانی نے جب آنکھ کھولی تو مجھے دیکھا۔ تمہارا بہت حق ہے اور تم ہی اس گھر کی مالک ہو، مگر یہ بھی تم تسلیم کرو گی کہ میری خوشی تمہاری خوشی ہے۔ میرا غم تمہارا غم ہے۔ مجھے اتفاقاً زاہدہ کی حالت پر رحم آگیا اور یہ رحم اب محبت میں بدل چکا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے تم سے محبت کم نہیں ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو میں تمہیں میکے سے واپس کیوں لاتا۔ آج تمہارے شوہر کی خوشی کا سوال ہے تم جو چاہو فیصلہ کر دو۔"

رضیہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی محکوم ہوں جو

آپ کہیں گے کروں گی "

اکرم:۔ پیاری رضیہ مجھے تم سے یہی امید تھی ،

رضیہ :۔ کاش آپ عورت کے دل کو سمجھ سکتے جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میری جوانی نے آنکھیں ہی آپ کی گود میں کھولی ہیں تو میرے سرتاج میں یہ کس طرح برداشت کرلوں گی کہ ایک غیر عورت جس کا آپ پر کوئی حق نہیں ہے۔ آپ کے دل کی رانی بن جائے،

ایک مرد کو بیک وقت دو عورتوں سے محبت نہیں ہو سکتی کسی ایک سے ہی محبت ہو سکتی ہے مگر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی میں صرف آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ کیا عورت آپ کی طرح انسان نہیں ہے۔

اکرم:۔ کون کہتا ہے کہ عورت انسان نہیں ہے،

رضیہ:۔ تو کل کو اگر میں آپ سے خدا نخواستہ یہ کہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور محلے کے فلاں شخص سے بھی محبت ہے تو یقیناً مجھے آپ جان سے مار ڈالیں گے مگر مرد اپنی بیوی سے صاف صاف کہہ سکتا ہے اور اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، تو بتائیے میں محکوم ہوں یا نہیں،

اکرم سن کر مسکرانے لگا اور بولا،

" اب تو میری رضیہ کو بھی بہت باتیں کرنی آگئی ہیں، مگر رضیہ میری اچھی رضیہ میں زاہدہ کو ابھی گھر سے نکال سکتا ہوں لیکن پھر میں خوش

نہ سکوں گا، اور شاید میرا مغموم چہرہ تم بھی نہ دیکھ سکو، تو پھر بتاؤ

میں کیا کروں۔

رضیہ:۔ آپ شادی کر لیجئے مگر اسے یہاں نہ رکھئے۔

اکرم:۔ تو پھر کہاں رکھوں۔

رضیہ:۔ کسی اور گھر میں رکھئے۔ میں دل پر پتھر رکھ کر دوسری

شادی کی اجازت تو دے سکتی ہوں مگر اس کے ساتھ رہنا میرے

امکان میں نہیں ہے۔

اکرم:۔ لیکن رضیہ مشکل تو یہ ہے کہ اس کا شوہر موجود ہے۔

رضیہ:۔ تو پھر وہ کہاں ہے۔

اکرم:۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے کیا کرتا ہے نہ اسے

ساتھ رکھتا ہے اور نہ طلاق دیتا ہے۔

رضیہ:۔ اے ہے غضب خدا کا، میرے سرتاج اللہ کو نہ بھولئے

ایک ذرا سی دلچسپی کی خاطر گناہوں کی گٹھڑی نہ باندھئے۔ وہ بیوہ

یا طلاق ہوتی تو خیر کوئی بات نہ تھی مگر ایسی صورت میں آپ کا اس سے

محبت کرنا میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔

اکرم بھی تھوڑی دیر کے لئے کھو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ ان باتوں کا

کیا حل ہو سکتا ہے۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا خیالی دنیا میں گھومتا رہا پھر اٹھ کر

زاہدہ کے پاس آیا۔

زاہدہ کہنے لگی ،

"مجھے رضیہ بہن کی باتوں سے اتفاق ہے ، میں نے سب گفتگو سن لی ہے واقعی یہ ان پر ظلم ہے ۔ ان کا حق ہے اور وہ ہر طرح اپنا حق حاصل کر سکتی ہیں"

اکرم :۔ کیا بتاؤں زاہدہ میں کچھ ایسی الجھن میں پھنس گیا ہوں کہ بیان سے باہر ہے ،

زاہدہ :۔ اکرم اس میں الجھن کی کوئی بات نہیں ہے تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ۔

اکرم :۔ زاہدہ وہ بات نہ کہو جسے میں نہ کر سکوں ۔

زاہدہ :۔ اب تم اس قدر مجبور کر رہے ہو کہ میں خود ہی کسی فیصلہ پر مجبور ہو جاؤں گی ۔

اکرم :۔ اچھا تو زاہدہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم اپنے ہی مکان میں رہو اور میں خرچ اٹھاؤں گا ۔

تھوڑی سی تکلف بازی کے بعد یہ بات طے ہو گئی ۔ اور زاہدہ اپنے گھر واپس آ گئی ۔ اکرم نے اسی گھر میں سارے انتظامات کرا دیئے ،

حنیف کو جب خبر ملی تو وہ سمجھ گیا کہ جمی کا تیر نشانے پر بیٹھا ۔ اب اس کے ذہن میں ایک اور اسکیم چکر لگانے لگی ۔ چند روز بعد وہ زاہدہ کے دروازے پر آیا اور دستک دی ،

زاہدہ نے پوچھا ،

"کون ہے"۔

"میں ہوں حنیف"

لیکن زاہدہ نے کہا۔

"میں تمہیں نہیں جانتی اور میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ تم چلے جاؤ"

حنیف کو غصہ تو اس قدر آیا کہ دروازہ توڑ دے اور زاہدہ کو اس قدر مارے کہ بے دم ہو جائے۔ مگر مصلحتاً خاموش ہو کر چلا آیا۔

دوسرے دن اس نے ایک پروگرام بنایا۔ جس میں اس کے دو اور دوست بھی شریک تھے۔ اور اسی رات تینوں نے زبردستی زاہدہ کے گھر میں گھس کر اس سے ایک خط اکرم کے نام لکھوایا جس کا مضمون یہ تھا۔

پیارے اکرم

سلام مسنون

شاید تمہیں تعجب ہو کہ زاہدہ بھاگ گئی مگر یہ بات نہیں ہے بلکہ زاہدہ اس لئے جا رہی ہے کہ اب اکرم کے پاس کچھ نہیں ہے وہ مفلس ہے۔ اور مفلس کے پاس زاہدہ کا رہنا اس کی توہین ہے لہٰذا میں جا رہی ہوں ایک دوسرے مالدار اکرم کے ساتھ۔ امید ہے کہ تم خیال نہ کرو گے۔

فقط

تمہاری زاہدہ

حنیف نے زاہدہ کو راتوں رات ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا اور اس کے ساتھ جو زیادتیاں ہو سکتی تھیں دریغ نہ کیا۔ صبح کو اکرم زاہدہ کے گھر آیا۔ تو وہاں اسے صرف وہ خط ملا جو زبردستی زاہدہ سے لکھوایا گیا تھا۔

اکرم کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس دنیا میں سب کی سب بیلو فر ہیں۔ فاحشائیں ہیں۔ عصمت فروش اور تاجر ہیں۔ وہ بڑی دیر تک اس پلنگ پر بیٹھا رہا اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ آج پہلی بار اس نے ایک بار کا دروازہ کھولا اور بے ساختہ وہسکی کے پیگ پر پیگ پینے لگا رات کے دو بجے کے قریب وہ جھومتا جھامتا گھر پہنچا۔

رضیہ اسے اس حالت میں دیکھ کر ڈر گئی اور پیچھے ہٹ گئی مگر جب اکرم صراحی کی ٹھوکر کھا کر زمین پر گر پڑا تو مجبوراً رضیہ آگے بڑھی اور اکرم کو پوری طاقت سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"میرے سرتاج آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے آج آپ نے شراب

بھی پی ہے۔

"اُف میرے خدا مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے" ۔ اکرم نے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے شرابی لہجے میں کہا۔ بکواس بند کر شراب تو امرت ہے امرت۔ جب آدمی پی لیتا ہے تو کھوٹے کھرے کی پہچان میں مشکل نہیں ہوتی۔ میں نے شراب پی کر سب کچھ پرکھ لیا ہے۔ (ایک بے ڈھنگا قہقہہ لگاکر) نیلوفر بھی رنڈی زاہدہ بھی رنڈی، رضیہ بھی رنڈی۔ سب عورتیں رنڈی ہیں"۔

رضیہ کا سانس تیز ہو گیا۔ وہ اکرم کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "اللہ کے واسطے زبان کو روکئے۔ شراب نے آپکو بکواس کر دیا ہے۔ آپ کی رضیہ زاہدہ اور نیلوفر نہیں ہو سکتی"۔

اکرم نہ جانے کب تک بڑبڑاتا رہا اور کب سویا رضیہ رات بھر روتی رہی اور خداوند کریم سے اپنے شوہر کی اصلاح کی دعائیں مانگتی رہی۔

حنیف نے زاہدہ کے ساتھ زیادتیوں کی حد کر دی تھی وہ اسے تین تین دن بھوکا رکھتا اور جب زاہدہ ضعف اور کمزوری میں غش کھانے لگتی۔ تب کہیں حنیف چند شرائط کے لیے اسے آدھا پیٹ کھانا دیتا اور کسی نئے آدمی کو اس سے متعارف کرا دیتا۔

ایک ہی ماہ میں زاہدہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اب وہ عورت نہیں بلکہ طوائف ہے سوسائٹی کا وہ مہلک کیڑا جس سے مہذب لوگ دامن بچاکر گذرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایسا گندہ اور متعفن

نالا ہے جس کی طرف سے گزرتے ہوئے لوگ ناک پر رومال رکھ لیں،

کافی سوچ بچار کے بعد زاہدہ نے حنیف سے کہا،

"آخر تم کیا چاہتے ہو"

حنیف نے ہنستے ہوئے کہا،

"اپنی محبت کا انتقام چاہتا ہوں"،

زاھدہ :- آخر وہ انتقام کب تک اور کس طرح پورا ہوگا،

حنیف :- کیا تم ہر دور سے گذرنے کیلئے تیار ہو،

زاہدہ ایک لمحہ کے لیئے رک گئی ۔ اور حنیف نے کہا،

"بولو زاہدہ، جواب دو۔

زاھدہ :- اب میرے لیئے کوئی دور اجنبی نہ ہوگا۔ کیا رہ گیا ہے میں تقریباً ہر دور سے گذر چکی ہوں اگر کوئی اور دور بھی باقی رہ گیا ہے تو اس سے بھی انکار نہیں ہے،

حنیف نے چہرے پر ایک دم سنجیدگی بکھیرتے ہوئے کہا،

"تو تم کوٹھے پر بیٹھنے کے لئے تیار ہو جاؤ"

زاہدہ کی آنکھوں میں ایک دم آنسو اس طرح چھلک پڑے جیسے کسی نے بھرے ہوئے پیمانے کو جھٹکا دیدیا ہو ۔ وہ آنسو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بولی،

"کوٹھے پر بٹھاؤ یا آسمان پر مجھے سب کچھ منظور ہے"

حنیف نے اسی دن زاہدہ کو الماس بائی کی تحویل میں دے دیا

تاکہ وہ اسے تھوڑا بہت گانا بجانا اور ناچ وغیرہ سکھا دے۔

ادھر سے مطمئن ہو کر اس نے جاوید سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی تقریباً ایک دو ہفتہ میں ایک بار ضرور اس سے ملنے لاہور جاتا۔

رضیہ پریشان تھی کیونکہ اکرم کو شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ ہر وقت شراب کے نشہ میں چور رہتا نہ کاروبار کرتا اور نہ کسی اور طرف توجہ دیتا تھا۔ بس ہر وقت بوتل تھی اور وہ تھا۔

رضیہ نے کچھ دن وہ کانوں کا کام سنبھالنا بھی چاہا مگر اکرم نے شراب کے لئے اپنا رہا سہارا بھی بیچ دیا۔

اب صرف وہ جائیداد باقی تھی جو نیلوفر کے نام تھی اور جس کا فیصلہ عدالت سے ہونا باقی تھی۔ گھر کی حالت یہاں تک خراب ہو چکی تھی کہ رضیہ کو مجبوراً فاقوں سے بچنے کے لئے میکے چلا جانا پڑا۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود فاقوں میں بھی رہ کر شوہر کے ساتھ زندگی گزار دیتی مگر چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھوک سے بلبلاتے دیکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اب اکرم اکیلا ہی گھر میں بیٹھا شراب پیتا رہتا۔

ان ہی ایام میں جبکہ اکرم کو پیسے کی بے حد ضرورت تھی عدالت نے فیصلہ اکرام کے حق میں دیدیا اور اکرم پھر سے اپنی جائیداد کا مالک ہو گیا۔ رضیہ کو جب خبر لگی تو وہ فوراً اکرم کے پاس آگئی تاکہ مبارکباد دے اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرے۔

رضیہ نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا تو اکرم مسکرایا اس وقت

بھی اس کے پاس سامنے کئی قسم کی شرابیں میز پر رکھی تھیں۔

رضیہ نے کہا۔

"مبارک ہو کہ عدالت کا فیصلہ آپ کے حق میں رہا، مگر خدا کے لئے اب تو۔۔۔۔۔"

وہ اپنا جملہ پورا بھی نہ کرنے پائی تھی، کہ اکرم بولا۔

مجھے کسی مبارکباد کی ضرورت نہیں ہے، جب جائیداد مل گئی ہے صاحب حیثیت ہو گیا تو تم بھی چلی آئیں، ورنہ مجھے مفلس دیکھ کر زاہدہ کی طرح تم بھی میکے چلی گئی تھیں۔۔۔۔۔

رضیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے سرتاج مجھے اپنی بھوک کا نہیں بلکہ بچوں کی بھوک کا خیال تھا"۔

اکرم نے ایک پھیکا سا قہقہہ لگایا اور رضیہ کو گھورتے ہوئے بولا۔

"نادان عورت جب خدا ایک شرابی کو شراب پینے کے لئے پیسے دے سکتا ہے تو کیا تمہارے بچوں کو رزق جس کا اس نے وعدہ کیا ہے نہ دیتا"!

رضیہ سے جواب نہ بن پڑا، اس نے اکرم کے پیروں پر سر رکھ دیا مگر اکرم نے بڑی لاپرواہی سے پیر کھینچ لئے اور کہا۔

"میرا وقت خراب نہ کر مجھے پینے دے خوب پینے دے یہاں تک

کہ عدالت سے ملی ہوئی ساری جائیداد اس جام میں گھول کر پی جاؤں

رضیہ :۔ مگر اب میں ایسا نہ ہونے دوں گی آپ پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہیں۔

اکرم :۔ ہم پر سوائے شراب پینے کے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

رضیہ :۔ کچھ بھی ہو مگر میں اب اس گھر کو اور آپ کو چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی۔

اکرم :۔ تمہاری مرضی مگر اس گھر میں جو رہیگا اسے میرے ساتھ شراب پینی پڑے گی۔

رضیہ :۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔

اکرم جھنجلا کر بولا۔

"الو کی پٹھی سے یہ نہ ہو گا وہ نہ ہوگا مگر رہے گی یہیں جیسے یہاں خدائی لٹ رہی ہے خیرات فنڈ کھلا ہے اپنا وقت بھی خراب کرتی ہے اور دوسروں کا بھی۔

رضیہ کئی گھنٹے اکرم کے پیچھے پڑی رہی مگر وہ جہاں تھا وہیں رہا۔

چھ ماہ گزر گئے زاہدہ ناچ گانے میں ایسی مشاق ہوئی کہ کوٹھا بھرا رہتا رنگ روپ بھی اچھا تھا اور جسم بھی جاذب تھا ایک طوائف کے لئے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا۔ زاہدہ اپنے پچھلے ماحول کو تقریباً بھول چکی تھی مگر اکثر اکرم اسے یاد آجاتا تھا۔ اور وہ

گھنٹوں یہ سوچتی کہ کس طرح اکرم سے صرف اتنا کہدے کہ وہ جو خط تم کو ملا تھا وہ مجھ سے زبردستی لکھوایا گیا تھا۔ وہ اکرم کو اپنا سچا پرستار سمجھتی تھی۔ اس لئے وہ اکرم کے خیال میں گھنٹوں کھوئی رہتی اور چونکہ وہ جانتی تھی کہ اکرم کبھی طوائف کے کوٹھے پر قدم نہیں رکھ سکتا اس لئے وہ بے جھجک کمرے سے نکل کر تماشائیوں میں آجاتی تھی۔ زاہدہ کا یہ اصول بن گیا تھا کہ باہر کے کمرے میں تماشائی بیٹھے ہوتے اور ایک طرف استاد جی اپنے ساز بجا رہے ہوتے کہ وہ اچانک اپنے کمرے میں سے رقص کرتی سب کے سامنے آجاتی۔

بعض اوقات زمانے کے اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں کہ انسان زمین سے آسمان تک پہنچ جاتا ہے اور فلک سے عمیق غاروں میں گر جاتا ہے۔ رضیہ اپنے شوہر اکرم کی طرف سے انتہائی پریشان تھی اس کا زیادہ تر وقت کچھ سوچتے یا روتے گزرتا تھا۔ رضیہ کے والدین حیات تھے اور ایک بھائی بھی تھا۔ اس کا میکہ متوسط قسم کا تھا اسی لئے اسے کم از کم روٹی کپڑے کی فکر نہ تھی مگر بچوں کے مستقبل کا خیال اسے بےچین کئے ہوئے تھا۔ دوسری طرف اکرم کی زندگی اس کی زندگی کا چھلا ہوا زخم بن چکی تھی۔ رضیہ کی شادی اکرم کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اکرم کو رضیہ سے محبت تھی اور رضیہ بھی اکرم کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ کیونکہ اکرم صاحب حیثیت شریف اور نہ سیلانو جوان تھا۔ رضیہ کے والدین یہ شادی کرنے کے لئے فوراً تیار ہو گئے

اور دو بے چین دل دھڑکتے ہوئے دل آپس میں مل گئے۔

رضیہ کے دل میں اب تک اکرم کے لئے وہی محبت کا جوالا مکھی موجود تھا۔ مگر اکرم دنیا و مافیہا سے بے خبر سب کچھ بھول چکا تھا۔

ایک دن رضیہ بچوں سمیت مکان کی چھت پر بیٹھی تھی۔ بچے کھیل رہے تھے اور وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ چھت کی دیواریں چھوٹی چھوٹی تھیں اچانک دونوں بچوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور دونوں منڈیر سے نیچے سڑک پر جا پڑے پہلے تو تین منزلہ مکان کی چھت سے گرنا ہی قیامت تھا۔

دوسرے یہ کہ سڑک پر ٹریفک کافی تھی آدھے ہی منٹ میں کئی گاڑیاں ان بچوں پر سے گذر گئیں اچانک شور سنکر رضیہ چونکی بچوں کو نہ پا کر اس نے سڑک کی طرف دیکھا تو کچلی ہوئی صورتیں اسے دکھائی دیں اس کی ممتا نے زور کیا وہ بلبلا اٹھی اور خود بھی نیچے کود گئی۔ رضیہ کے بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ کر بائیں جانب پسلیوں میں گھس گئی۔

رضیہ کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ اپنے بچوں کو اکیلا چھوڑنے پر تیار نہ تھی چند گھنٹے بعد مر گئی۔

اکرم کا خسر اپنے مکان کے صحن میں تینوں لاشوں کو لٹا کر اکرم کو بڑی خوشامد کر کے لایا اور کہا۔

"چلو آج نئی قسم کی شراب تمہیں ہم پلائیں"۔

جب اکرم آیا اور اس نے معصوم بچوں کے کھلے ہوئے دیکھے اور اپنی محبوبہ رضیہ کے چہرے کی مردنی دیکھی تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اگر وہ اس وقت نشہ میں نہ ہوتا تو شاید اس شدید غم زدہ واقعہ کی تاب نہ لا کر اس کے قلب کی حرکت بند ہو جاتی۔ اکرم کی آنکھوں میں آنسو ایک دم خشک ہو گئے، کبھی وہ ایک بچے کے چہرے سے چادر ہٹاتا اور ہولے ہولے باتیں کرتا اور کبھی دوسرے بچے سے اور کبھی رضیہ کے مردہ گالوں کو تھپتھپا کر کہتا،

" چلو رضیہ میں تمہیں لینے آیا ہوں "

مگر رضیہ اب میکے اور سسرال کے جھگڑوں سے آزاد ہو چکی تھی اکرم کا عالم مجنونانہ تھا وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرا اور گھر آ کر اس نے اس قدر شراب پی کہ شاید ہی کوئی انسان پی سکے، مگر اس کی نظروں سے بچوں کی اور رضیہ کی تصویر نہ ہٹ سکی۔ دوسرے دن سے اکرم نے طوائفوں کے کمرے بھی جھانکنے شروع کر دیئے تاکہ وہیں اس کے دل کو کچھ سکون مل سکے مگر سکون کی تلاش اب اس کے لئے آب حیات سے کم نہ تھی،

حنیف نے جاوید کو مدعو کیا کہ وہ راولپنڈی آئے اور وہاں کا بازار حسن دیکھے گو جاوید راولپنڈی نہ آنا چاہتا تھا کہ کہیں زاہدہ کی صورت نظر نہ پڑ جائے، تاہم حنیف کے اصرار نے اسے مجبور کر دیا اور وہ صرف اس شرط پر راضی ہوا کہ صرف ایک ہی طوائف کے کوٹھے

پر جا کر بیٹھ جائے اور وہیں سے واپس لاہور چلا آئے گا۔ ـــــ اور شہر میں ایک منٹ کے لئے نہیں گھسے گا۔

حنیف نے یہ شرطیں منظور کر لیں۔ اور جاوید راولپنڈی آگیا۔ اور اسے الماس کے بالا خانہ پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ ایک اور صاحب کی معرفت اکرم کو بھی یہیں بلوا لیا گیا۔

اس وقت تماشائیوں میں اکرم، جاوید اور حنیف بیٹھے تھے۔ سازندوں نے ساز بجانے شروع کر دیئے تھے اور زاہدہ اسی ڈرامائی انداز لئے اپنے کمرے سے باہر آنے والی تھی۔

زاہدہ کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ آج بڑے بڑے لوگ آئیں گے اس لئے تمہارے انداز میں بلا کی شوخی اور آواز میں قیامت کا لوچ ہونا چاہیئے۔

اکرم نشے میں چور گردن جھکائے گاؤ تکیہ سے سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ جاوید بھی نشہ میں چور اکرم کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا اور حنیف آج اپنے انتقام کے لپکتے ہوئے شعلوں کی خاکستری کا تماشہ دیکھنے کا منتظر تھا۔

سازوں نے آواز لگائی اور ایک دم زاہدہ اپنے کمرے سے منہ آنچل ڈالے بیگانی ہوئی نکلی۔

"کبھی تم بھی ہم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"۔

وہ گھونگروں کی تال پر آگے بڑھی اکرم نے اچانک گردن اوپر اٹھائی

اسے یہ آواز جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ زاہدہ جونہی اکرم کے سامنے آئی ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اکرم ہکا بکا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"زاہدہ"۔

زاہدہ کا نام سنکر جاوید نے بھی گردن اٹھائی اور وہ بھی حیرت سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور اس کے منہ سے بھی سوالیہ انداز میں "زاہدہ" نکلا۔

زاہدہ بدحواس ہو کر زینہ کی طرف بھاگی اکرم اور جاوید اس کے تعاقب میں تھے زاہدہ جیسے ہی سیڑھیوں سے اتر کر سڑک پر آئی چند سپاہی ایک ملزم کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بلا رہے لے جا رہے تھے۔

ملزم نے زاہدہ کو دیکھا تو ایک دم ٹھہر گیا اور باجی کہکر "زاہدہ" کی طرف لپکا یہ فیاض تھا۔ جو خون کے الزام میں پھانسی کی سزا کا حکم سن کر جیل لے جایا جا رہا تھا۔

اکرم اور جاوید کی بھی فیاض سے آنکھیں ملیں اور جھک گئیں۔

زاہدہ پر پے در پے چوٹیں پڑیں اور وہ بالوں کو نوچتی ہوئی بولی۔

"اف یہ فیاض ہے مگر پھانسی کے تختہ کے لئے۔ یہ میرا شوہر جاوید ہے مگر ایک طوائف کے لئے۔ اور یہ میرا محبوب اکرم ہے مگر شراب کے لئے ہاہا۔ ہی ہی۔ آہاہا۔ ہو ہو ہو۔ ہی ہی ہی

حنیف بھی پیچھے آکر سب کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی، اس نے اپنا انتقام پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کے سارے منصوبے بچے بغیر بگڑے پورے ہو گئے تھے۔

جاوید نے حنیف کی طرف دیکھا اور اس کی شیطانی مسکراہٹ جاوید کے سینے میں اتر گئی۔

اکرم ندامت سے آنکھیں جھکائے زاہدہ کے پیروں کو دیکھ رہا تھا جس میں گھنگھرو بند ہے ہوئے تھے۔ اور زاہدہ کے پورے بدن میں لرزاں طاری تھا۔ اس کی آنکھیں ویران ہوتی جا رہی تھیں۔

یہ وہ بدنصیب زاہدہ تھی جس کو کوئی بھی سچا پیار نہ دے سکا۔ اس وقت اس کے سامنے اس پر جان چھڑکنے والا شوہر جاوید کھڑا تھا اور اس وقت اس کے سامنے اس کا محبوب اکرم کھڑا تھا اور اس وقت اس کے سامنے اس کو برباد کرنے والا رقیب حنیف کھڑا تھا۔ لیکن زاہدہ کو ان کی صورتیں ٹھیک نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اسے یہ تینوں دھندلے دھندلے عکس نظر آ رہے تھے پھر اس کو احساس ہوا جیسے یہ تینوں سائے نہیں بلکہ کوئی

اور چیز ہوں۔ کیا ہو سکتے ہیں؟

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اچانک اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔

اس کو ایسا لگا جیسے۔ یہ تینوں انسان نہیں بلکہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں جنہوں نے اس کی شگفتہ زندگی کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہی چلی گئیں اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔

حنیف کی نظریں جاوید سے چار ہوئیں۔ جاوید کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ آنکھیں یک ٹک حنیف کو گھور رہی تھیں۔ جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کو پی جانا چاہتا ہو۔

حنیف کے پورے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کا بدن کانپ اٹھا۔

اچانک جاوید کے ہاتھوں میں سات انچ لمبا ایک چاقو نظر آیا۔ اور چشم زدن میں حنیف خاک و خون میں لتھڑا ہوا زمین پر تڑپ رہا تھا۔

"کسی کو کچھ سمجھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔"

جاوید کے ہاتھوں میں اب بھی کھلا ہوا چاقو تھا اب اس کا

نشانہ اکرم تھا۔۔۔۔

لیکن پہلے واقعہ سے اکرم کچھ ہوشیار ہو گیا تھا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں مدغم ہونے لگا۔

جاوید بڑھا لیکن اکرم نشے کے باوجود لوگوں کے پیچھے جا چکا تھا۔

چند آدمیوں نے پیچھے سے جاوید کو بڑی مضبوطی سے تھام لیا۔

اور پھر چند منٹوں میں جاوید ہتھکڑیاں پہنے ہوئے حوالات کی طرف جا رہا تھا۔

چند دن کے بعد جاوید کو سزائے موت کا حکم صادر کر دیا گیا۔ اور زاہدہ کا دماغ خراب ہو گیا۔

اور آج بچے اسی زاہدہ کو سڑک کے کنارے ایک گوشے میں پھٹے ہوئے کاغذوں اور کپڑوں کے ڈھیر میں لیٹا ہوا دیکھ کر کنکر اور پتھر مارتے ہیں۔ اور پگلی پگلی کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ مگر پگلی کسی کے پتھر کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ بلکہ پتھر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور پھر خوب ہنستی ہے۔ بے تکے قہقہے لگا کر کہتی ہے۔

"ہی ہی۔ ہاہا۔ یہ پتھر تو میرے ہیں۔ ہاہاہا" اور پھر کہتی ہے " نہ جاوید میرا نہ اکرم میرا نہ خیالِ میرا نہ دنیا میری

ہی ہی.. ہا ہا... ہا۔ ہو... ہو...
مگر یہ پتھر تو میرے ہیں۔ ہاہاہا جو میرے جسم سے آ کر لگ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ ایک عجیب ہیبت ناک قہقہہ لگا کر سڑک پر بھاگتی ہے۔ "اور بچے پگلی آ گئی۔ پگلی آ گئی کہتے ہوئے گھروں میں گھس جاتے ہیں"

ختم شد

شوکت صدیقی

سول ایجنٹ
سمیع اللہ۔ نعمت اللہ۔ تاج بکڈپو اردو بازار گورکھپور

محترمہ رقیّہ خاتون

کا

ایک لازوال رومانی شاہکار

نگینہ

ضرور پڑھیے

رضیہ بٹ کا

ایک یادگار ناول

نشیمن

پہلی فرصت میں پڑھیں